باب پندرہ

اجنبی مسافر

فضاء میں فقط دو ہی آوازوں کا شور تھا۔ایک ساحل سے ٹکراتیں، ٹھاٹھیں مارتی سمندر کی لہروں کا شور اور دوسرا ریسکیو ٹیموں کے مسلسل بجتے سائرن کا شور۔علاقہ چاروں جانب سے پولیس کے گھیرے میں تھا۔گھڑی صبح کے چار بجا رہی تھی اور ریسکیو آپریشن پچھلے ڈھائی گھنٹے سے جاری و ساری تھا۔

سیاہ جینز پر سیاہ جیکٹ پہنے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے،اونچائی پر کھڑا نوید ساکت نظروں سے نیچے ریسکیو ٹیم کو مسلسل جدوجہد میں مصروف دیکھ رہا تھا۔آنکھ کے کنارے لگے پرانے زخم میں آجکل درد اٹھنے لگا تھا۔ نظروں کا زاویہ تبدیل کیا تو بائیں جانب اونچائی پر ہی قطار میں رکھے بڑے بڑے پتھروں میں سے ایک پر حسین بیٹھا ہوا تھا۔عمر اُسکے پاس کھڑا اُسے کچھ کہہ رہا تھا، سمجھا رہا تھا یا تسلی دے رہا تھا؟ معلوم نہیں۔علی چہرے پر دکھ کے تاثرات لیے کھڑا کچھ دور نیچے ساحل کنارے ،ریسکیو آپریشن میں مصروف ٹیم کو دیکھ رہا تھا، جبکہ مقدّم بے چینی سے دائیں بائیں چکّر کاٹ رہا تھا۔نوید نے کلائی اوپر کر کے گھڑی دیکھی جو صبح کے چار بجا رہی تھی، سحری کا وقت شروع ہو چکا تھا۔اُس نے گہری سانس لیکر قدم اُس جانب بڑھا دیئے، جہاں وہ چاروں تھے۔یہ تو طے تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی آج گھر واپس نہیں جائے گا۔

اِس بات کو تین گھنٹے گزر چکے تھے،جب اُس سڑک چھاپ نے بتایا تھا کہ رضا نے سمندر میں چھلانگ لگادی ہے۔ حسین کو اگر وہ لوگ روکتے نہیں تو شاید وہ خود ہی سمندر میں ڈھونڈنے نکل پڑتا۔آدھا گھنٹہ ریسکیو ٹیموں کو آنے میں لگا،اُس وقت سے اب تک رضا کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا تھا۔اُسکا سامان نوید نے اُٹھا کر پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ماہر غوطہ خور سمندر میں بھی اُترے تھے، لیکن اندھیرا ہونے کی وجہ سے واپس آگئے۔

آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا نوید،اُس پتھر کے قریب پہنچا، جس پر حسین بیٹھا تھا۔اُسکے پیچھے پولیس موبائل کھڑی تھی۔

''شیراز!''نوید نے پولیس موبائل سے ٹیک لگائے کھڑے، شیراز کو آواز دی تو حسین نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔

''یس سر!''شیراز اُسکے قریب آیا۔ حسین نے پراُمید نظروں سے اُن دونوں کو دیکھا کہ شاید کوئی خبر آئی ہو۔

''رضا کے فلیٹ کی سی سی ٹی وی نکلوائی؟'' نوید نے پوچھا۔

''سی سی ٹی وی مل گئی ہے۔اُس میں ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ شخص کو دیکھا گیا ہے، جو آخری باراُن سے ملنے آیا تھا۔'' شیراز نے بتایا۔

''ہونہہ۔۔۔''نوید نے سرہلایا۔''وہی اُسکا باپ ہے۔ جلد از جلد اُسے گرفتار کرواور اُسے کہو کہ اگر۔۔۔''وہ رکا اور ایک نظر حسین کو دیکھا، پھر دوبارہ شیراز کی جانب متوجہ ہوا۔''اگر رضا نہ ملا، یا اُسے کچھ بھی ہوا، تو سارا جرم اُس شخص کا ہوگا کیونکہ آخری بار وہی رضا سے ملا تھا۔''

''اِس سے کیا ہوگا؟'' پاس کھڑا مقدّم پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''فقط ایک رات بھی جیل میں گزارنا، اُسکی ساکھ کو اتنا نقصان پہنچادے گا کہ وہ دوبارہ رضا کو تنگ کرنے سے پہلے ہزار بار سوچے گا۔''نوید نے کہا تو شیراز سر ہلاتے ہوئے چلا گیا۔

''وہ سب بعد کی باتیں ہیں نوید! ابھی رضا کو ڈھونڈنا ضروری ہے۔''حسین نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ہم کوشش کررہے ہیں حسین!''اُس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔اُسی لمحے ریسکیو آفیسر نے اشارہ کیا، جسے سمجھ کر نوید سر ہلاتے ہوئے اُسکی جانب بڑھ گیا۔

''کیا ہوا؟ کچھ پتہ چلا؟''پتھروں میں سے راستہ بنا کر نیچے ریسکیو آفیسر کے قریب آتے ہوئے نوید نے پوچھا۔

''جناب اندھیرا بہت ہے، اس وجہ سے لاش ڈھونڈنا مشکل ہے۔ ہمیں صبح کی روشنی کا انتظار کرنا چاہیے۔''

''لاش؟''نوید کے منہ سے بیساختہ نکلا تھا۔

''ہاں! لاش۔۔۔اتنے گہرے سمندر میں چھلانگ لگانے کے بعد کوئی نہیں بچ سکتا، خصوصاً جب اتنا وقت بھی گزر چکا ہو۔اگر لاش آج نہ ملی، تو ایک دو دن میں خود ہی کنارے آجائے گی، کیونکہ سمندر اِس موسم میں اتنا چڑھا ہوا نہیں ہوتا۔''اُسکا رضا کو بار بار لاش کہنا نوید کا دل دہلا رہا تھا۔

''وہ زندہ بھی تو مل سکتا ہے۔'' حالانکہ جو بات وہ کہہ رہا تھا، اُس پر اُسے خود بھی یقین نہ تھا، لیکن فقط ایک اُمید۔۔۔۔

''ناممکن!''آفیسر نے نفی میں سر ہلاتے، اُسکی آخری اُمید بھی توڑ دی۔اُس نے چہرہ موڑ کر اونچائی پر کھڑے اپنے دوستوں کو دیکھا۔وہ آس بھری نظروں سے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔اُنہیں بتانا ہی تو سب سے مشکل کام تھا۔

''ٹھیک ہے! آپ تلاش جاری رکھیں۔''نوید نے کہا اور واپس اوپر آیا۔چاروں نے ڈھیروں سوالات نظروں میں لیے اُسے دیکھا، وہ رک گیا۔کہنے کے لیے الفاظ نہ ملے۔

''کیا ہوا نوید؟''عمر نے خدشوں بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اندھیرا ہونے کی وجہ سے۔۔۔''وہ رکا، تیز سمندری ہوا اُسکے بال اُڑا رہی تھی۔

''ڈیڈ باڈی (لاش) تلاش کرنے میں مشکل ہو رہی ہے۔''اِن الفاظ پر پانچوں نے تڑپ کر اُسے دیکھا تھا، پر اُس نے بات جاری رکھی۔

''ہمیں انتظار کرنا ہو گا حتیٰ کہ سمندر خود ڈیڈ باڈی ساحل پر پھینک دے۔''اُس نے کتنی مشکل سے یہ سب کہا تھا، صرف وہ ہی جانتا تھا۔

''میری بات سنو۔۔۔''حسین کو نجانے کیا ہوا؟ اُس نے یکدم ہی اُسکا گریبان پکڑا تھا، نوید خاموش کھڑا رہا۔

''تم اُسے بار بار ڈیڈ باڈی کیوں کہہ رہے ہو؟ ہاں؟''وہ چیخا نہیں تھا، دھاڑا تھا۔

''حسین! رکو! بات سنو۔۔۔''مقدّم نے اُسے پیچھے ہٹانا چاہا پر اُس نے اُسکا ہاتھ جھٹک دیا۔

''تم نے اُسے ایک بار بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی؟ وہ گمشدہ ہے، مرا نہیں ہے۔۔۔''حسین نے سرخ آنکھوں سے اُسے دیکھا، سمندری ہوا اُسکے بال اُڑا کر ماتھے پر لے آئی تھی۔

''حسین! میں نے تمہیں وہی بتایا جو مجھے معلوم ہے۔ اُس نے یہاں سے چھلانگ لگائی ہے اور۔۔۔'' نوید نے ضبط کرتے ہوئے، اُسے سمجھانا چاہا۔

''ایک سڑک چھاپ نشئی کی بات پر کیسے یقین کر سکتے ہو تم؟'' حسین نے اُسکا گریبان جھٹکے سے چھوڑتے ہوئے تاسف سے کہا۔ نوید نے لب بھینچ کر اُسے دیکھا۔

''حسین! تم یہاں آؤ۔۔'' عمر نے اُسے بازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹانا چاہا، پر وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔

''تم نے اب تک اُسے ڈھونڈنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے نوید! جیسے علی نے مقدّم کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی تھی۔'' وہاں کھڑے کسی بھی شخص کو کم از کم حسین سے اِس جملے کی توقع نہ تھی۔ وہ واحد شخص تھا، جس نے نہ اب تک کسی کو الزام دیا تھا، نہ دس سال پہلے کا حوالہ۔ پر آج یہ بھی ہو گیا تھا۔

''تو تمہیں کیا لگ رہا ہے کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں اتنی دیر سے؟'' بلآخر نوید کی برداشت بھی جواب دے گئی، تو اُس نے سختی سے پوچھا۔

''وقت برباد کر رہے ہو بس!'' وہ غصّے سے کہتا آگے بڑھا، اُسکا چہرہ ضبط کی شدت سے لال ہو رہا تھا، تنفس پھول رہا تھا۔

''میں اپنے حواس بحال رکھتا ہوں حسین! ہم خالی سڑکوں پر رضا کو نہیں ڈھونڈ سکتے۔'' نوید نے اُسکا بازو پکڑ کر اُسے روکنا چاہا، جسے اُس نے جھٹکے سے چھڑوایا تھا۔

''ایک جگہ کھڑے رہنے سے بھی وہ نہیں مل سکتا، تمہیں آگے بڑھ کر دیکھنا چاہیے۔'' وہ ماننے کو تیار نہ تھا، باقی تینوں خاموشی سے کھڑے، یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

''تو کہاں ڈھونڈوں اُسے؟ زمین کھود دوں یا آسمان میں سیڑھی لگاؤں؟ جہاں اُسے آخری بار دیکھا گیا ہے، وہیں سے مل سکتا ہے نا وہ۔۔۔'' نوید کی آواز بلند ہوئی تھی۔

''بس کر دو تم دونوں۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔'' مقدّم حلق کے بل چیخ اُٹھا۔

''تم لوگ ہر مشکل گھڑی میں، ہر پریشانی میں ایک دوسرے سے لڑنے، اور ایک دوسرے کو الزام دینے کیوں کھڑے ہو جاتے ہو؟''اُس کا ضبط شاید جواب دے گیا تھا۔ فجر کی اذانیں سنائی دینے لگی تھیں، آج وہ سحری کے بنا ہی روزہ رکھنے والے تھے۔

''اِس طرح کرنے سے کبھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا، نہ پہلے ہوا ہے اور نہ اب ہو سکے گا۔''اب کہ اُس نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو دونوں خاموش ہوئے۔

''یہ لو! پانی پیو۔''علی نجانے کہاں سے پانی کی بوتلیں لے آیا تھا؟ اُس نے دونوں کی جانب بڑھائی۔ نوید نے لے لی جبکہ حسین نے اُسے دیکھا۔

''اذان ہو رہی ہے۔۔۔''اُس نے آہستہ سے کہا۔

''ابھی شروع ہوئی ہے، تم پانی پی سکتے ہو۔''علی نے نرمی سے کہا، تو اُس نے بوتل کھول کر منہ سے لگالی۔ چیخ چیخ کر حلق خشک ہو چکا تھا۔

تم غصّے میں ہو، تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔

میں تمہیں اکیلے جانے نہیں دوں گا۔

میں ساتھ آرہا ہوں۔

نوید کو اپنی اور رضا کی آخری ملاقات یاد آئی۔ ہزار اجنبیت، ہزار ناراضگی، اور ہزار شکوؤں کے باوجود وہ اُسے تنہا چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ تو کیا نوید اُسے تنہا چھوڑ سکتا تھا؟

اُس نے آپکی بہن کی جان بچائی تھی، آپ کو ہر صورت اُسکو بچانا ہے۔

جزا کی آواز کانوں میں گونجی، احسان تو واقعی کیا تھا اُس نے نوید پر۔ وہ خاموشی سے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ صبح کی روشنی پھوٹنے لگی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے بھاگ رہی تھیں۔

عدالت تو تمہارے جیسے طاقت والے لگاتے ہیں۔

ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا وہ۔۔۔اگر نوید کے پاس طاقت تھی تو وہ اُسے ڈھونڈ سکتا تھا، وہ کیوں دیر کر رہا تھا؟ کیا اُس نے یہ یقین کر لیا تھا کہ رضا مر چکا ہے؟

پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھے حسین کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

''میں آگے جا کر دیکھوں گا۔'' وہ یکدم ہی کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''حسین! رک جاؤ۔۔۔'' عمر نے اُسے روکنا چاہا۔

''وہ مل جائے گا عمر! اُسے کچھ نہیں ہوا ہو گا۔'' اُس نے عمر سے زیادہ خود کو یقین دلانا چاہا تھا۔

''ریسکیو ٹیم ڈھونڈ رہی ہے اُسے، دیکھو! اب تو روشنی بھی ہونے لگی ہے۔ تھوڑی دیر میں غوطہ خور بھی آ جائیں گے۔'' اب کہ مقدّم نے اُسے تسلّی دینی چاہی، جبکہ تسلی دینا ہی بے حد مشکل تھا۔ حسین اس وقت حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

''اُس کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔۔رضا کے ساتھ نہیں۔۔۔ایسا نہیں نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' وہ اپنے آپ سے کہتا ہوا پتھر پر ڈھے سا گیا۔

''حسین!'' عمر اُسکے قدموں میں بیٹھا، دور سے یہ منظر دیکھتا نوید بیساختہ سیدھا ہوا اور پھر اُنکی طرف بڑھا۔

''اُس نے مجھے بتایا تھا۔۔۔وہ اتنے عرصے ريہیبلیشن سینٹر میں رہا تھا۔ وہ بہت مشکل سے اپنی زندگی میں کچھ بن سکا تھا۔۔۔اُسکے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' وہ بول رہا تھا۔ اور سب سن رہے تھے، اُسکی بے ربط باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں، پر وہ کچھ بتا رہا تھا۔

وہ رات اُنکے درمیان آ ٹھہری۔۔۔

خاموش کچن کا کاؤنٹر۔۔۔

چائے کی ختم ہوتی دو پیالیاں۔۔۔

آنلائن مارٹ سے منگوائی گئی ڈبل روٹی۔۔۔

سامنے بیٹھے وہ دو نفوس۔۔۔۔

جیل کے ٹھنڈے فرش پر گزاری گئی رات۔۔۔۔

اور اُس رات کے قصّے کو زبان بخشا وہ قصہ گو۔۔۔۔

رضائے الٰہی۔۔۔

----------+---------+--------

سانحے سے چھے ماہ قبل:

ایم بی اے کا آخری سال تھا، وہ ایک کوچنگ سینٹر میں ٹیچر کی نوکری کر رہا تھا۔ تنخواہ بہت زیادہ نہ تھی، لیکن اتنی ضرور تھی کہ اُسکو ضرورت کے لئے ہاتھ نہیں پھیلانے پڑتے تھے۔ البتہ اُسکی یونیورسٹی کی فیس ماموں ہی بھرتے تھے اور جو پالتا ہے وہ احسان جتانا نہیں بھولتا، یہی دنیا کا دستور ہے۔ کافی عرصے سے وہ مختلف کمپنیوں میں اپنی گریجویشن کی بنا پر نوکری کے لئے درخواستیں دے رہا تھا۔ اُس روز اُسے ایک اچھی ملٹی نیشنل کمپنی سے انٹرویو کے لیے کال آئی تو وہ بے انتہا خوش ہوا۔ سب سے پہلے اُس نے حسین کو فون کیا اور اِس بارے میں بتایا، اُس نے دل بھر کر اُسے دعائیں دیں اور بہت ساری نصیحتوں کے بعد پورے اعتماد سے انٹرویو دینے کی تلقین کی۔

اگلی صبح وہ اُٹھا تو انٹرویو میں اچھا دکھنے کے لئے، الماری کھول کر کچھ پہننے کو تلاشنے لگا۔ لیکن الماری میں چند جرسیوں اور جینز، یا کچھ پرانی شرٹوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ اُسکا دل دکھا، جو کپڑے اُسکے پاس تھے، وہ کسی طور اتنی بڑی فرم میں پہن کر جانے کے لائق نہ تھے۔ اِس وقت اُسکے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ وہ جا کر فوری طور پر کوئی پر تکلف سا لباس خرید سکتا، جبکہ ایچ آر کی جانب سے فراہم کردہ معلومات میں واضح لکھا تھا کہ فارمل لباس پہن کر آنا ہے۔ اُس پر عجیب مایوسی کی سی کیفیت طاری ہونے ہی لگی تھی کہ اُسکے کوارٹر کا دروازہ بجا، وقت دیکھا تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ اُس نے انٹرویو دینے کے لئے جامعہ کی چھٹّی کی تھی۔

''اِس وقت کون آگیا؟'' اُس نے سوچا، اگر ماموں بلا رہے ہوں گے تو وہ کسی صورت نہیں جائے گا۔ وہ ایسے ہی اُسے وقت بے وقت کسی نہ کسی کام کے لیے بلا لیتے تھے۔ اُس نے کوارٹر کا دروازہ کھولا تو سامنے چوکیدار کھڑا تھا، اُسکے ہاتھوں میں ایک گتّے کا ڈبہ تھا۔

''کیا ہوا؟''اُس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہ پارسل آیا ہے آپکے لیے۔۔۔''چوکیدار نے ڈبہ اُسکی جانب بڑھا دیا۔

''میرے لیے؟''اُس نے حیران ہوتے ڈبہ تھاما۔چوکیدار لاعلمی سے کندھے اُچکاتا وہاں سے چلا گیا۔ رضا ڈبہ لیکر حیران سا اندر آیا اور اُس پر لگا ٹیپ اُتار کر اُسے کھولا۔اندر موجود سامان دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ تین عدد پیک کی ہوئی شرٹ ساتھ میں تین عدد پینٹ،ایک پیک شدہ جوتے کا ڈبہ اور سامان کے نیچے رکھا ایک عدد لفافہ۔ وہ ساکت سا بیٹھا رہ گیا۔بھلا کون اس وقت فرشتہ بن کر آیا تھا؟اُس نے جلدی سے لفافہ اُٹھا کر کھولا۔

''جانتا ہوں کہ تم یہ تحفہ دیکھنے کے بعد مجھے ٹھیک ٹھاک گالیوں سے نوازو گے۔لیکن پہلے انٹرویو ضروری ہے،اِس لیے گالیاں انٹرویو کے بعد گھر آ کر دے لینا۔''

تمہارا ڈھیٹ دوست

حسین مرتضیٰ

پی۔ایس:رائل کلرز تم پر اچھے لگتے ہیں۔

وہ کتنی ہی دیر ہاتھوں میں وہ رقعہ تھامے ساکت اور جامد بیٹھا رہا۔پہلی بار کسی کا خیال رکھنا،اُسے خود ترسی یا احسان مندی کی کیفیت میں نہیں لے گیا تھا۔پہلی بار کسی کے دیئے گئے سامان نے اُسکی عزت نفس اور اُسکی خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔اُس نے نم آنکھوں سے شرٹوں کو دیکھا،نجانے اُسے کیسے معلوم ہوا کہ رضا کو اِسکی ضرورت ہو گی؟اگر اندازہ بھی لگایا تو اتنا درست اندازہ؟ایک شرٹ گہرے میرون رنگ کی تھی،دوسری شرٹ نیوی بلیو اور تیسری گہری جامنی۔سب کے ساتھ تھوڑے ہلکے شیڈ کی پینٹیں تھیں،رنگوں کا امتزاج بہت ہی بہترین تھا۔وہ تمام رائل کلرز تھے۔رضا مسکرایا،اُسے پہلی بار کسی نے تحفہ بھیجا تھا،اور بھیجنے والے نے محبت اور خلوص کا سمندر رہا دیا تھا۔اُسکی دھونس بھری محبت پر رضا کو پیار آیا۔

عجیب انسان تھا حسین۔۔۔

خیال رکھتا تھا اور جتاتا بھی نہیں تھا۔۔۔۔

احساس کرتا تھا، پر محسوس بھی نہیں ہونے دیتا تھا۔۔۔۔

ہنساتا تھا، پر آنکھوں میں نمی لے آتا تھا۔۔۔۔

پتہ نہیں کس مٹّی سے بنا تھا؟

--------+---------+----------

نو بجے کے قریب رضا کمپنی پہنچا اور اپنے بارے میں مطلع کر کے انتظار گاہ میں آ بیٹھا۔ اگر اُسے ذرا دنیا کی پرواہ ہوتی، یا وہ ذرا آس پاس نظریں ہی ڈال لیتا تو اُسے معلوم ہو جاتا کہ سانولی رنگت اور کھڑے نین نقش والے اُس پر کشش نوجوان کو کتنی ہی آنکھوں نے ستائش سے دیکھا تھا۔ بہت سوں نے تو پہلی کے بعد دوسری اور تیسری نظر بھی اُس پر ڈالی تھی۔ وہ ہر نگاہ کا مرکز تھا پر ارد گرد سے عادتاً بے نیاز بھی۔۔۔

انتظار گاہ میں پورے اعتماد کے ساتھ بیٹھے وہ اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا کہ اسی لمحے وہاں ایک عجیب سی ہل چل مچی، آس پاس کام کرتے ملازمین اپنی جگہ سے کھڑے ہونے لگے اور مینیجر نے بھاگ کر آفس کا بڑا دروازہ کھولا۔ یقیناً کوئی بڑی شخصیت آ رہی تھی۔

بلیک سوٹ میں کروفر کے ساتھ چلتے، تنی گردن کے ساتھ سیدھا اپنے آفس کی جانب بڑھتے وہ اور کوئی نہیں، بلکہ واصف الٰہی تھے۔ اُنکے پیچھے ملازمین انکا بیگ اور سامان اُٹھائے آ رہے تھے۔ نہیں! رضا کی آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ وہ اُسکا باپ ہی تھا، جسے شاید اُسکی یہاں موجودگی کا علم بھی نہ ہو۔

اُسے بالکل توقع نہیں تھی کہ سترہ سال بعد اُسے، اِس فرم میں اپنا باپ نظر آ سکتا ہے۔ اُنکے انداز سے تو لگتا تھا کہ وہ کسی بڑے اور اچھے عہدے پر ہیں۔ اُسکی نظروں کے سامنے سے ہی وہ بے نیازی سے چلتے اپنے آفس کے دروازے کے پیچھے گم ہو گئے۔ وہی بے نیازی جو رضا نے اُن سے ورثے میں پائی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے باپ کو دیکھتا، رضا یکدم ہی کھڑا ہوا، آس پاس لوگوں نے اُسے مڑ کر حیرت سے دیکھا، پر خود کو بمشکل گھسیٹتا وہ ریسیپشن تک آیا۔

''جی کہیے؟'' ریسیپشن پر بیٹھی لڑکی جو کب سے اُسے پُرستائش نظروں سے دیکھے جا رہی تھی، اُسکے وہاں آنے پر خود کو سیدھا کرتی خوش اخلاقی سے بولی۔

''ی۔۔۔یہ۔۔۔یہ کون تھے۔'' اُس نے بمشکل واصف صاحب کے آفس کی جانب اشارہ کرکے پوچھا۔

''واصف الٰہی! ہماری کمپنی کے چیف فائنانس آفیسر۔'' اُس نے خوشی خوشی بتایا۔

''پر۔۔۔میں نے تو سنا تھا کہ۔۔۔یہ کینیڈا میں تھے۔'' اُس نے ذرا سنبھل سنبھل کر کہا۔

''کینیڈا میں تو وہ آج سے پندرہ سال پہلے ہوا کرتے تھے۔ پندرہ سال سے واصف صاحب کمپنی کے اِس خطے میں سی ایف او ہیں۔ اور پاکستان میں ہی ہیں۔'' وہ پہلے ہی رضا کی شخصیت سے مرعوب تھی، بنا کچھ سوچے سمجھے ہی اُسے سب بتانے لگ گئی۔ اور رہا رضا۔۔۔تو اُسکے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں جیسے مفلوج ہو چکی تھیں۔

پندرہ سال۔۔۔پندرہ سال وہ اِس دھوکے میں زندگی گزارتا رہا کہ اسکا باپ اُس سے سات سمندر دور ہے۔ پندرہ سال وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتا رہا کہ شاید اُسکا باپ اُسے دیارِ غیر میں بلا نہیں سکتا۔ جبکہ وہ تو یہیں تھے۔ پچھلے پندرہ سالوں سے وہ اسی ملک، اسی شہر میں تھے۔ لیکن اپنی سگی اولاد سے بے خبر۔۔۔تو کیا وہ اتنا غیر اہم تھا؟ کیا اُنکا ایک بار بھی دل نہیں چاہا کہ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ ہی لیں؟

اُسے نہیں معلوم وہ کمپنی کی بلڈنگ سے کب نکلا؟ اُسکے وہاں سے بنا انٹرویو دیئے آجانے سے اُسکا کیا تاثر گیا؟ اُسے کسی بات کی نہ کوئی فکر تھی نہ ہی کوئی خبر۔۔۔جب دماغ نے کام کرنا شروع کیا تو اُس نے خود کو اپنے گھر میں، ماموں کے کمرے کے سامنے کھڑا پایا، وہ یقیناً اندر تھے۔ اُس نے نہ کوئی دستک دی نہ اجازت لی۔ دروازہ دھاڑ سے کھولا اور اندر چلا آیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ محوِ گفتگو ماموں نے اُسے ناگواری سے دیکھا تھا۔

''ابّو کا ایڈریس (پتہ) اور انکا نمبر چاہیے مجھے۔ فوراً!'' اُس نے درخواست نہیں کی تھی، حکم دیا تھا۔

''کیا؟ کیا کہا؟ دوبارہ کہنا ذرا!'' اُنہوں نے اداکاری کی تھی۔

''ابّو پچھلے پندرہ سالوں سے پاکستان میں ہیں، کراچی میں ہیں۔ اور آپ یقیناً اُنکا ایڈریس جانتے ہیں۔ مجھے ابھی اور اسی وقت، اُنکا نمبر اور پتہ چاہیے۔'' اُس نے ضبط سے کہا۔ قریب بیٹھا اُسکا کزن اُسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اُسکی نظریں رضا کو مذاق اڑاتی محسوس ہوئی تھیں۔

''اور میں ایسا کیوں کروں؟'' ماموں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اُسے دیکھا۔ رضا کو وہ دونوں اس وقت شدید زہر لگ رہے تھے۔

''میں اپنی بات دہراؤں گا نہیں ماموں!'' اُس نے چبا چبا کر کہا۔

''اچھا چلو! میں تمھیں اُنکا نمبر اور پتہ دے دیتا ہوں، ٹھیک! لیکن تم وہ لیکر کیا کروگے؟ اُنکے پاس جا کر، اپنی غربت کے رونے رو کر اُن سے بھیک مانگو گے؟'' اِس بات پر پاس بیٹھا انکا بیٹا ہنسا تھا۔ رضا کی کان کی لوئیں تک لال ہو گئی تھیں۔ اُس نے ضبط کیا، پھر میز پر دونوں ہتھیلیاں جماتے ہوئے اُنکی جانب جھکا۔

''ہمیشہ آپ بھیک مانگتے آئے ہیں، آج میں مانگ لوں گا تو کیا ہوا؟'' اُس نے اُن سے بھی زیادہ استہزائیہ انداز میں کہا تو دونوں باپ بیٹے کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

''حد میں رہو اپنی۔۔۔'' اُنہوں نے شعلہ بار نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

''آخری دفعہ۔۔۔۔ صرف آخری دفعہ کہہ رہا ہوں۔ مجھے انکا ایڈریس چاہیے۔''

''ذلیل ہونے کا شوق ہے تمھیں؟ تمہارا باپ تمھیں نہ تو گلے لگائے گا اور نہ ہی تمھیں دیکھ کر اُسکا دل بھر آئے گا۔'' وہ جیسے اُسے کچھ سمجھانا چاہتے تھے۔

''میرے اور میرے باپ کے بیچ یہ فاصلے پیدا کرنے والے آپ ہی ہیں۔ پہلی بار جب اُنہوں نے مجھے فون کیا تھا، تو میں نے بات کرنے سے انکار کیا تھا۔ پر اُس کے بعد سے، میرے علم میں لائے بغیر ہی آپ نے انہیں، میری طرف سے انکار کرنا شروع کر دیا۔ آپ نے انکے دل میں میرے لیے، اور میرے دل میں انکے لیے نفرت ڈالی ہے۔ پر آج میں آپکا کوئی حربہ کام نہیں آنے دوں گا۔'' وہ ہنسے۔۔۔ دل کھول کر ہنسے۔ اور رضا کو یہ ہنسی اپنے دل کے آرپار محسوس ہوئی۔

''کن احمقوں کی جنت میں رہتے ہو تم؟ اتنی خوش فہمی؟ پہلی بار بھی اُس نے یہ جاننے کے لیے فون کیا تھا کہ کہیں اُسکی ماں، یعنی تمہاری دادی نے مرنے سے پہلے تمہیں اپنی کچھ چیزیں، کچھ زیورات وغیرہ چھپا کر دے تو نہیں دیئے؟ جیسے کہ یہ گھر اُنہوں نے اپنی بہو کے نام کر دیا تھا۔ تم اِس خوش فہمی سے نکل آؤ کہ تمہارے باپ کو تمہاری یاد ستا رہی تھی۔'' اُنہوں نے اُسکی ذات کے بخیے اُدھیڑ دیئے تھے۔ رضا کی برداشت یہاں ختم ہو گئی۔ اُسے بہت اچھے سے یقین تھا کہ اُسکے ماموں، اُسکے باپ اور اُسکے درمیان غلط فہمیاں ڈالنے کے لیے یہ کر رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ جو پیسے وہ رضا کے باپ سے بٹورتے ہیں اُسکا سلسلہ رکے۔ وہ ہر صورت رضا کو اُن سے ملنے سے باز رکھیں گے۔ اور وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ واقعی احمقوں کی جنت میں رہتا تھا!

اگلے ہی لمحے رضا نے پاس رکھا شو پیس اٹھایا اور برابر میں بیٹھے اپنے کزن کے سر پر دے مارا۔

''رضا!'' ماموں ہڑبڑا کر اٹھے۔ رضا اُن کے بیٹے کا سر پھاڑنے کے بعد رکا نہیں، بلکہ گریبان سے پکڑ کر اُسے پیٹنا شروع کر دیا۔

''رضا چھوڑو اُسے۔۔۔'' ماموں اُسے بیچ میں چھڑوانے آئے پر اُس نے اُنہیں دھکا دے دیا۔

''مجھے جو چاہیے وہ دے دیں، ورنہ آج اسکا حشر کر دوں گا۔'' اُس نے ماموں کے بیٹے کو گردن سے پکڑ کر اُسکا چہرہ میز پر لگایا اور اُن سے دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے۔۔۔ میں دے رہا ہوں۔'' اُنہوں نے جلدی سے ڈائری کھولی اور ایک صفحے پر لکھا ایڈریس اور نمبر پھاڑ کر اُسکے حوالے کیا۔ رضا نے کاغذ لیکر اُنکے بیٹے کو جھٹکے سے چھوڑا، وہ بیچارہ ادھ موا ہو چکا تھا۔ اُسکے بعد وہ کسی کو بھی دیکھے بنا ہی باہر نکل گیا۔

''میرا بیٹا!'' ماموں نے اپنے بیٹے کو سہارا دے کر اُٹھایا۔

''میں اسکا بدلہ ضرور لوں گا رضا!'' اُنہوں نے اپنے بیٹے کے ماتھے سے خون صاف کرتے ہوئے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔

----------+---------+--------

وہ گھر نہیں تھا۔۔۔ محل تھا۔ وہ محل جس میں اُسکا باپ پچھلے پندرہ سالوں سے مقیم تھا۔ اور اُسکا ولی عہد پچھلے سترہ سالوں سے ایک دڑبے جیسے کوارٹر میں زندگی گزار رہا تھا۔ اُس نے اپنے ابّو کو فون نہیں کیا تھا، بلکہ سیدھا اُنکے پتے پر پہنچا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فون پر اُسکی آواز سن کر

وہ شاید فون کاٹ دیں کہ ماموں نے اُن دونوں باپ بیٹوں کے درمیان بہت بڑی دیوار کھڑی کر دی تھی، اور اِس میں غلطی رضا کی بھی تھی کہ اگر شروع میں ہی وہ اپنے باپ سے ملنے کی ضد کر لیتا، تو آج ایسی زندگی نہ گزارنی پڑتی۔ وہ اُن ملنے سیدھا گھر آیا تھا، یقین تھا کہ وہ دروازے سے تو اُسے واپس نہیں لوٹائیں گے۔ وہ واقعی خوش فہم تھا!

اُس نے اُنکے گھر کے باہر بیٹھ کر سارا دن انتظار کیا، جانتا تھا کہ وہ آفس میں ہیں۔ شام کے تقریباً پانچ بجے اُسے ایک گاڑی گھر میں داخل ہوتی نظر آئی، جس میں پیچھے اُسکا باپ بیٹھا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر گاڑی تک جانا چاہتا تھا، پر راستے میں آنے والی دو اور گاڑیوں کی وجہ سے اُسے رکنا پڑا اور اتنی دیر میں واصف صاحب اندر چلے گئے۔ رضا سڑک پار کر کے دروازے تک آیا۔

''ابّو!۔۔۔'' نجانے کیا سوچ کر اُس نے دروازے کے باہر سے ہی آواز دی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے لڑکے؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟'' اُسکی اِس حرکت پر چوکیدار اُسے ڈانٹتا ہوا اُسکے پاس آیا۔

''کیا کر رہے ہو یہ؟'' اُس نے رضا کو غصّے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں واصف صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''واصف صاحب ہر کسی سے نہیں ملتے۔''

''مگر وہ مجھ سے ملیں گے۔'' اس نے کہا۔ وہ واقعی خوش فہم تھا!۔۔۔ احمقوں کی جنت میں رہتا تھا!

''کیوں؟ تم اُنکے باس لگتے ہو؟''

''میں انکا بیٹا ہوں۔ رضا الٰہی۔۔۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں! اور میں انکا دادا ہوں۔'' چوکیدار نے مذاق اڑایا۔ ''چلو جاؤ یہاں سے۔۔۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں؟'' اُس نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔ رضا نے کافی ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے، جیب سے ایک پرچی نکالی۔

''میں اُنکا بیٹا ہوں، اور جب انہیں معلوم ہو گا کہ تم نے اُنکے بیٹے کو دروازے پر کھڑا رکھا ہے، تو تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہو گا؟'' وہ کہتے ہوئے اُس پرچی پر لکھے نمبر کو فون میں لکھنے لگا۔ وہ خوش فہم تھا!۔۔۔ حد سے زیادہ خوش فہم!

''تم جو بھی ہو، میں انکی اجازت کے بنا کسی کو اندر آنے نہیں دے سکتا۔''اب کہ چوکیدار تھوڑا تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔رضا نے فقط سر ہلاتے ہوئے واصف صاحب کو فون ملا دیا۔ بیل جاتی رہی، اُسکا دل دھڑکتا رہا۔اور پھر فون اُٹھالیا گیا۔

''ہیلو! کون؟''سترہ سال بعد بھی وہ اِس آواز کو پہچان گیا تھا۔

''اب۔۔۔ابّ۔۔۔''الفاظ اُسکے گلے میں اٹکنے لگے۔''ابّو!''اور پھر ادا ہو گئے۔

''کون بات کر رہا ہے؟''اور سترہ سال بعد وہ اسکی آواز نہیں پہچان سکے۔

''ابّو! میں۔۔۔رضا۔۔۔''اپنی پہچان کروانی چاہی، آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔چوکیدار تھوڑا مشکوک ہونے لگا۔

''رضا؟''وہ حیران ہوئے تھے یقیناً!

''میرا نمبر کہاں سے آیا تمہارے پاس؟''اُنکی آواز میں سختی تھی۔اُس کی ساری خوش فہمی ہوا ہونے لگی۔

''ابّو! میں ملنا چاہتا ہوں آپ سے۔۔۔آپ کے گھر کے باہر کھڑا ہوں۔''ایک اور امید۔۔۔ایک اور آس۔۔۔شاید وہ اندر بلا لیں گے۔

''تم باہر کھڑے ہو؟''وہ جیسے مزید حیران ہوئے تھے۔

''ذرا ایک منٹ رکو!''اُنہوں نے کہا اور فون کاٹا، رضا کو ایک پل کی خوشی ملی، اُسکا باپ اُسکے لیے آرہا تھا۔

''آرہے ہیں وہ۔۔۔''اُس نے نم آنکھوں اور خوشی بھرے لہجے سے چوکیدار کو بتایا کم اور جتایا زیادہ۔وہ اب بھی مشکوک سا کھڑا تھا۔اسی لمحے۔۔۔بالکل اُسی لمحے، دروازے کے پاس بنے اسپیکر میں سے آواز اُبھری۔

''اجمل خان!''یہ اُسکے باپ کی آواز تھی۔

''جی سر!''چوکیدار گڑبڑایا، اُسے رضا کی باتوں کی صداقت پر بھروسہ نہیں تھا۔پر اب وہ ڈر گیا۔

''دروازے پر کوئی لڑکا کھڑا ہے کیا؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''کوئی لڑکا؟''رضا کی مسکراہٹ سمٹنے لگی۔

''ہاں سر! آپکا بیٹا۔۔۔''چوکیدار جلدی سے بتانے لگا ہی تھا کہ۔۔۔

''فارگاڈسیک! تمہیں کس نے کہہ دیا کہ وہ میرا بیٹا ہے؟''اُنکی جھنجھلائی ہوئی آواز اُبھری اور رضا کا پورا وجود زلزلوں کی زد میں آگیا۔

''اُس لڑکے نے کہا کہ۔۔۔''چوکیدار وضاحت دینے لگا۔

''تمہیں کوئی کچھ بھی کہے گا اور تم مان لو گے؟''اُنہوں نے ڈانٹا۔

''وہ لڑکا میرے رشتے دار کا بیٹا ہے۔پیسے ویسے مانگنے آیا ہو گا، تمہارے پاس ابھی کچھ نقدر قم ہے تو اُسے دے کر چلتا کرو۔مجھ سے بعد میں لے لینا۔''رضا کے پاس اختیار نہ تھا، ورنہ وہ اِس لمحے خود کو سماعتوں سے محروم کر لیتا۔اپنی یاداشت گم کر لیتا۔پر جو ابھی ہوا، اُسے سنتا نہ کبھی یاد رکھتا۔۔

''جی سر! ٹھیک ہے۔''چوکیدار نے کہا اور رضا کی جانب متوجہ ہوا۔اُسکی نظروں نے رضا کو زمین میں گاڑ دیا تھا۔وہ بیزاری سے جیب میں ہاتھ ڈالتے کچھ نوٹ نکالنے لگا۔

''یہ پکڑو! اور دوبارہ مت آنا تنگ کرنے۔''اُس نے پیسے اُس کو دیئے نہیں تھے۔اُسکے منہ پر پھینکے تھے۔جیسے روزانہ ہی کوئی نہ کوئی اُنکے در پر بھیک مانگنے آتا ہو۔

''اب چلو! جاؤ یہاں سے۔۔۔''وہ ساکت نظروں سے زمین پر بکھرے نوٹوں کو دیکھنے لگا۔ذلت کے کئی رنگ دیکھے تھے پر یہ نیا تھا۔نفرت کے کئی روپ دیکھے تھے پر یہ سب سے برا تھا۔وہ پتھرائی آنکھوں، اور ساکت ہوتے جذبات کے ساتھ خود کو گھسیٹتا واپس مڑا۔

''اوہ ہیرو! پیسے تو لیتے جاؤ۔یہ کم ہیں کیا؟''پیچھے سے چوکیدار کی استہزاء کرتی آواز آرہی تھی پر وہ خود کو گھسیٹتا ہوا چلتا رہا۔

''نخرے دیکھو اسکے۔۔۔''وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا۔پر رضا رکا نہیں۔وہ خوش فہم تھا تو اسکی خوش فہمی آج ہزاروں ٹکڑوں میں ختم ہوئی تھی۔خود وہ ٹوٹا تھا، ریزہ ریزہ ہوا تھا، ذرہ ذرہ بکھرا تھا۔اپنے بکھرے وجود کے ساتھ وہ جہاں سے گزرتا اسے لگتا لوگ اُسے ہی دیکھ رہے ہیں۔وہ کتنی اُمید سے گیا تھا اپنے باپ کے پاس؟

''یقیناً! ابّو کے پاس اُنکی بیوی بیٹھی ہو نگی۔ اُنکی وجہ سے اُنہوں نے ایسا کہا ہو گا۔ وہ مجبور ہوں گے۔ اور وہ مجھ سے اکیلے ملنے آئیں گے۔'' وہ خود کو پھر کسی خوش فہمی میں مبتلا کرنا چاہتا تھا۔ پر اس بار اُسے ایسا لگا، جیسے پوری دنیا اُسے طنزیہ نظروں سے دیکھ رہی ہے، اُسکا مذاق اڑا رہی ہے۔ اُس پر ہنس رہی ہیں۔ ہر نظر تمسخر اُڑاتی، ہر آواز دل جلاتی محسوس ہو رہی تھی۔

تم وہ لیکر کیا کرو گے؟ اُنکے پاس جا کر، اپنی غربت کے رونے رو کر اُن سے بھیگ مانگو گے؟

اُسکے ماموں نے اگر اُسے بھکاری سمجھا تھا تو باپ نے اُسے واقعی بھکاری بنا دیا تھا۔

وہ محبت کا بھوکا تھا۔ وہ محبت لینے ہی تو گیا تھا۔ پر ہر شخص اُسے رسوا کیوں کر دیتا تھا؟

آج پھر اُسے ماں یاد آئی تھی۔

اِس سے زیادہ ذلت اور کیا ہو گی کہ صبح جس گھر سے یہ کہہ کر نکلا تھا کہ باپ کے پاس جا رہا ہوں، واپس اُسی گھر آنا پڑا۔ سر جھکائے، خاموشی کے ساتھ۔ لیکن آنے والا وقت اُس سے بھی کڑا تھا۔

گھر پہنچا تو ماموں اور ماموں کا بیٹا دروازے پر ہی کھڑے تھے، وہ حیران ہوا۔ اُنکی وہاں موجودگی پر نہیں! بلکہ ساتھ کھڑے پولیس والوں کو دیکھ کر۔

''یہی ہے انسپکٹر صاحب! اسی نے میرے بیٹے پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ گرفتار کر لیں اسے۔'' ماموں نے اُسے دیکھتے ہی اُسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اِس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا، پولیس والوں نے اُسے گھیرے میں لے لیا، جیسے وہ کوئی بہت ہی بدنام زمانہ مجرم ہو۔

''مم۔۔۔ میں نے۔۔۔۔ کچھ نہیں کیا۔'' ساری دنیا سے بے نیاز رہنے والے، اور ہر بات سوچ سمجھ کر کرنے والے رضا کی آواز، زندگی میں پہلی بار آنے والے وقت کے خوف سے کانپی تھی۔ محلّے والے بڑے ذوق وشوق سے تماشا دیکھ رہے تھے۔

پولیس والے آگے بڑھے اور اُسکے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی۔

''ماموں! ماموں! انہیں روکیں۔۔۔۔ میں معافی مانگتا ہوں آپ سے۔۔۔۔۔'' وہ ذلت اور رُسوائی کی آخری سیڑھی تھی۔ وہ بدنامی نہیں چاہتا تھا، اُسکی ایک زندگی تھی، بے شک جیسی بھی تھی لیکن صاف ستھری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اُسکا کوئی نہیں ہے، کوئی نہیں ہے جو اُسے

بچائے گا۔اپنی عزت نفس کو کچل کراُس نے معافی مانگنا بہتر سمجھا۔لیکن آج تک کس نے اُسکی سنی تھی؟پولیس والے اُسے وین میں ڈالنے لگے تو اسکی برداشت کی حد ہو گئی۔

''چھوڑو مجھے! گرفتار کرنا ہے تو انہیں کرو۔۔۔ان فرعونوں کو کرو۔۔۔میرے حق پر غاصب بن کر بیٹھے ہیں یہ لوگ۔۔۔یہ میرا گھر ہے۔۔۔میری ماں کا گھر ہے۔۔۔اِس پر قبضہ کر کے بیٹھے ہیں یہ۔۔۔''وہ حلق کے بل چلا رہا تھا۔پولیس والے اُسے زبردستی وین میں ڈال کر وہاں سے لے گئے۔۔۔پر اُسکی آسمان گرادینے والی، عرش کو ہلا دینے والی آواز پورے محلّے نے سنی،اب ہر شخص مشکوک نظروں سے اُسکے ماموں کو دیکھ رہا تھا۔اُنہوں نے گھر کے اندر واپس جانے میں ہی عافیت جانی تھی۔

--------+---------+----------

''کھولو دروازہ۔۔۔میں نے کچھ نہیں کیا۔وہ لوگ جھوٹے ہیں۔۔۔غاصب ہیں۔۔۔میں نہیں۔۔۔''لاک اپ کی سلاخوں کو تھامے وہ حلق کے بل چلا رہا تھا۔اور پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ یہی کر رہا تھا۔

''چپ کر جا اُوئے! دماغ خراب کر کے رکھا ہے کب سے۔''میز پر ٹانگ چڑھائے بیٹھے،پولیس والے نے تنگ کر کہا۔

''نہیں ہوتا میں چپ!۔۔۔مجھے نکالو یہاں سے۔۔۔اُس نے میرے گھر پر۔۔۔میرے حصے پر قبضہ کیا ہے۔۔۔نکالو مجھے۔۔۔''چیخ چیخ کر اُسکا گلا بیٹھ گیا۔

''کیا ہو گیا ہے؟''اُسکی چیخنے کی آواز سن کر بلآخر سب انسپکٹر وہاں آ گیا۔

''سر! اِس لڑکے نے تنگ کر کے رکھا ہوا۔''اُسے دیکھ کر کانسٹیبل سیدھا ہوا تھا۔

''ذرا اِسکا منہ بند کرواؤ! نہیں چپ ہوتا تو زبردستی چپ کرواؤ۔پر مجھ تک اِسکی آواز نہیں آنی چاہیے۔''وہ حکم دیتا واپس چلا گیا۔اُسکے بعد اُس کانسٹیبل سمیت مزید تین پولیس والے اُسکی جیل کی طرف بڑھے،انہیں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر رضا کا دل لرزہ ضرور تھا۔لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔لاک اپ کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئے،آس پاس قید دیگر قیدیوں نے اٹھ کر اُسکی طرف دیکھا۔کچھ خوف سے،کچھ فکرمندی سے۔پولیس والوں نے دروازہ اندر سے بند کیا۔

''بہت غصّہ چڑھا ہے نا تیرے دماغ میں۔۔۔ ابھی نکالتے ہیں۔ رک ذرا!'' اُسکے بعد وہ چاروں اُس پر پل پڑے۔ اُسے اپنے جوتوں سے، گھونسوں سے اور ڈنڈوں سے اِس قدر مارا کہ وہ زمین بوس ہو گیا۔ وہ چار تھے اور وہ اکیلا، انکا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اُسے مارتے رہے مارتے رہے، یہاں تک کہ جب مار مار کر تھک گئے تب اُسے چھوڑا۔ رضا جیل کے ٹھنڈے فرش پر منہ کے بل پڑا ہوا تھا۔

''عزت راس نہیں آرہی تھی نہ تیرے کو؟'' کانسٹیبل نے جوتے سمیت اُسکے منہ پر پاؤں رکھا، پر اُس لمحے رضا کی ساری عزت نفس، انا اور سارا وقار پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ وہ کچھ محسوس کرنے کے لائق نہیں رہا تھا، اپنے دل میں کوئی جذبات محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

''اب پڑا رہ تُو یہاں!'' اُس نے جوتے سے اُسکا چہرہ مسلا اور اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔

فرش پر بے سدھ پڑا رضا نجانے کتنی دیر اسی حالت میں رہا؟ بہت دیر بعد کچھ ہمت کر کے آنکھیں کھولیں تو ہر شے دھندلی سی نظر آئی۔ کوئی آیا تھا لاک اپ میں۔۔۔ نجانے کون تھا؟ اُس نے آنکھیں جھپکانی چاہیں۔ منظر سمجھ آیا پر چہرہ واضع نہ ہوا۔ آنے والا وجود اُسکے پاس پنجوں کے بل بیٹھا۔ اُسکے سر پر ہاتھ رکھا، نرمی سے، پیار سے، محبت سے۔۔۔ پھر اُسکے بال سہلائے۔ اب کہ اُس نے پوری آنکھیں وا کر کے آنے والے کو دیکھا۔

''امی!'' اُسکے منہ سے آہستہ سے نکلا۔

''میری پیاری امی!'' اُس نے پھر کہا، آنکھوں سے ایک آنسو ٹوٹ کر بہا۔

''اُٹھ جاؤ رضا! صبح ہو گئی ہے۔ اسکول نہیں جانا؟'' ماں پیار سے بال سہلاتی اُٹھا رہی تھیں۔ پر آج وہ اٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایسے ہی لیٹے رہنا چاہتا تھا، اُن سے لاڈ کروانا چاہتا تھا۔

''امی!'' اُس نے دوبارہ کہا۔ پر ماں کا ہیولا غائب ہونے لگا، جگہ جگہ سے مٹنے لگا۔ رضا نے نقاہت زدہ ہاتھ اٹھایا تا کہ وہ اس ہیولے کو فنا ہونے سے روک سکے پر اُسکا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا اور ماں کا وجود دپانی ہو گیا۔

مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال نی

''اُٹھ جا اوئے! تجھے کوئی لینے آیا ہے۔'' کسی نے پانی کی ٹھنڈی بالٹی اُس پر الٹی تھی تا کہ وہ اٹھ جائے۔ اور وہ واقعی ہوش میں آ گیا، سارا جسم درد کر رہا تھا۔ اُٹھ کر بیٹھا تو بالوں سے ٹپکتے پانی نے چہرہ بھی بھگو دیا۔

''اُٹھ کر باہر آ جا۔ تُو واپس جا رہا ہے۔'' پولیس والا اطلاع دیکر چلا گیا۔ اور جیل کے ٹھنڈے فرش پر، اپنے گیلے کپڑوں اور کرچی کرچی وجود کے ساتھ بیٹھے رضا نے شدت سے اپنی ماں کے پاس لوٹ جانے کی دعائیں مانگی تھیں۔

پولیس والے اُسے زبردستی اُٹھا کر سہارا دیکر باہر لائے۔ باہر ماموں اور ساتھ محلے کے ایک دو بزرگ کھڑے تھے۔ ماموں اُسے دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھے، اور جلدی سے اُسے سہارا دیا۔

''تم لوگوں نے مارا ہے اسے؟ کیوں؟ ہاتھ کیسے لگایا اسے؟'' وہ چیخے تھے۔ رضا خاموش رہا۔

''دیکھا! نہیں آیا نہ تمہارا باپ تمہیں بچانے کے لئے؟'' اُنہوں نے رضا کو کہا، لیکن انداز ایسا تھا جیسے ڈانٹ رہے ہوں۔ وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

''ارے میں نے تمہیں اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ ٹھیک ہے! بیٹے کا خون دیکھ کر اور بیوی کا رونا سن کر تم پر غصّہ آ گیا تھا، پر تمہیں یہاں بھیج کر میں بھی سکون سے نہیں رہ سکا۔ اپنے بیٹے اور بیوی سے ناراضگی مول کر یہاں آیا ہوں تمہیں چھڑانے۔ آخر تم بھی تو میرے بیٹے ہو۔'' وہ اُسکا چہرہ تھامے جذباتی لہجے میں بولے، رضا نے ٹوٹی نگاہیں اُٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ بہترین اداکار تھے۔ داد کے مستحق۔۔۔

محلے والوں کی نظر میں وہ تھوڑے اونچے ہو گئے، رضا کو چپ لگ چکی تھی۔ وہ اُسے لیے گھر آئے تو وہ خاموشی سے اپنے کوارٹر آ گیا۔ راستے بھر اُسکے محلّے کے بزرگ اُسے سمجھاتے رہے، دوسرے لفظوں میں اُسکے ماموں کی عظمت کے قصیدے اُسے سناتے رہے۔ اور اُسے اُنکا فرمانبردار، اطاعت گزار رہنے کی تلقین کرتے رہے کہ انکی نظر میں اُسکے ماموں سے اچھا کوئی انسان ہی نہ تھا۔

کوارٹر میں آیا تو ٹوٹے پھوٹے سے آئینے میں اپنا عکس دکھائی دیا۔ حسین کے بھیجے گئے کپڑے اب بھی اُسکے وجود کا حصہ تھے، پر اب انکا حال برا ہو چکا تھا۔ اُس نے خاموشی سے جا کر کپڑے بدلے۔ ماموں نے کھانا بھجوا دیا تھا۔ جو کہ ملازم اُسکے بستر پر رکھ کر چلا گیا تھا۔ وہ پہلے چپ چاپ ٹرے میں رکھے کھانے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک نوالہ توڑ کر منہ میں ڈال تو آنسو کا ایک قطرہ آنکھوں سے بہہ نکلا۔

دُکھاں دی روٹی، سُولاں دا سالن آہیں دا بالن بال نی

مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال نی

اُس نے خاموشی سے بیٹھ کر ذلت کی روٹی کھائی۔ اُسی لمحے کوارٹر کا دروازہ کھلا۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو ماموں کھڑے تھے۔

''آج اپنی اوقات اچھے سے سمجھ آگئی ہو گی تمہیں؟ اسی گھر میں تمہارے لیے پناہ ہے اور یہیں تم نے مرنا ہے۔ آئندہ ایسی حرکت کی تو بچانے نہیں آؤں گا۔ پڑے سڑتے رہنا وہیں۔'' وہ اندر بھی نہیں آئے کہ اِس قید خانے میں قدم رکھنا وہ اپنی توہین سمجھتے تھے۔ دروازے سے ہی اُسے اُسکی اوقات یاد دلا کر وہ چلے گئے۔ مزید نوالے حلق سے نیچے نہ اُترے تو کھانا وہیں چھوڑ کر وہ باہر نکل گیا۔ سڑکوں پر بے مقصد پھرتا رہا، جس محلے میں اُسکی تھوڑی بہت عزت تھی، آج وہ وہاں بھی ذلیل ہو گیا تھا۔

تھک کر پاس رکھی بینچ پر آ بیٹھا۔ تنہائی میں بیٹھے دن بھر کے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ ماموں کی بے حسی، باپ کی نفرت، چوکیدار کا منہ پر پیسے مارنا، پولیس والوں کا تشدد۔۔۔ دن بھر کا غبار باہر نکلنے لگا۔ وہ سسکا، پھر رویا اور بلآخر آنسوؤں کو راستہ مل گیا۔ وہ روتا رہا۔۔۔ روتا رہا۔۔۔

پھر کوئی آیا۔۔۔ کوئی رحم دل شخص۔۔۔ کوئی مہربان دوست۔۔۔

وہ عمر تھا، نجانے اُس نے رضا کو وہاں کیسے ڈھونڈا؟ پر اُس نے ایک لفظ پوچھا نہ کوئی سوال کیا۔ اُسے اپنے ساتھ لگائے، اُسے تسلی دیتا رہا، اُسکا سر سہلاتا تھا۔ اور رضا کو اسی شے کی ضرورت تھی۔ وہ کچھ بھی کہے بنا، بے آواز روتا رہا۔

یہ پہلی بار تھا جب کسی نے اُسے گلے لگا کر تسلی دی تھی۔ کچھ بھی پوچھے بغیر، کچھ بھی جانے بغیر۔۔۔

عمر حفیظ نے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔

--------+---------+----------

رمضان کا پہلا روزہ اور دوسری سحری والی رات:

"میں تو تمہارے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیتے لیتے ٹیرس پر چلا گیا تھا۔ اچھی سیٹنگ کر رکھی ہے تم نے۔" وہ کاؤنٹر کے سامنے رکھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اپارٹمنٹ واقعی خوبصورت تھا۔ جواباً رضا خاموشی سے پیالیوں میں کافی چھینٹنے لگا۔ بہت دیر خاموشی چھائی رہی۔ اتنی کہ رضا کو سر اٹھا کر دیکھنا پڑا۔ وہ اُسے ہی جانچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اب تمہیں کیا ہو گیا؟" وہ کافی کی پیالیاں کاؤنٹر پر رکھ کر اُسکے ساتھ والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"تم نے کیوں کیا تھا ایسا؟" اُسکا سوال وہی تھا، جس سے وہ نظریں چرا اتار رہا تھا۔

"کیا کیا میں نے؟" انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"وجہ علی نہیں تھا رضا!" حسین نے یکدم ہی سنجیدگی سے کہا تھا۔

"وجہ صرف علی ہی تھا۔" اُس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں! میں نہیں مانتا۔ تم نے اس روز جو بھی کیا تھا، اُسکی وجہ علی نہیں تھا۔ تم نے کچھ چھپایا تھا ہم سے۔" وہ ماننے کو تیار نہ تھا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو کہ وہ جھگڑا میری وجہ سے ہوا تھا؟" اُسکے ماتھے پر بل پڑے۔

"نہیں! لیکن اُس جھگڑے کو ہوا تم نے دی تھی۔" اُس نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"تو تم دس سال پہلے کا حساب مانگنے آئے ہو مجھ سے؟" وہ تلخ ہوا۔

"نہیں! میں صرف جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ وجہ جاننا چاہتا ہوں میں بس!"

"کوئی وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ مجھے غصّہ آ گیا تھا۔" اُس نے وضاحت دینا چاہی۔

"تم نے جو الزامات علی پر لگائے تھے وہ بے وجہ نہیں تھے اور نہ غصّے کی وجہ سے تھے۔ تم نے اس روز جو کیا پورے ہوش و حواس میں جانتے بوجھتے کیا۔"

"اگر تمہیں اسی بارے میں بات کرنی ہے تو تم جا سکتے ہو۔" اُس نے بے مروتی سے کہا تھا۔

''میں یہاں آیا اپنی مرضی سے ہوں تو جاؤں گا بھی اپنی مرضی سے ہی۔''اُسکی ڈھٹائی کو داد دینے کا دل کیا۔

''آخر تم چاہتے کیا ہو؟''رضا نے تھک کر پوچھا تو جواباًوہ خاموش رہا۔خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تو رضا کو اپنی بدلحاظی کا احساس ہوا۔

''میں۔۔۔میں بس۔۔۔بات نہیں کرنا چاہتا اس موضوع پر۔''اب کے اُس نے آہستہ سے وضاحت دی۔وہ اُسکا محسن تھا۔وہ بھلا اُس سے اس طرح کیسے بات کر سکتا تھا؟

''میں نے تمہیں ڈھونڈا تھا رضا! بہت ڈھونڈا تھا۔ہر اُس جگہ جہاں تمہارے ملنے کی ذرا سی بھی اُمید تھی۔''حسین نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا تھا۔رضا کا دل دکھنے لگا،وہ اور اس انسان سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔ذہن کے پردے پر وہ خوفناک یاد چلنے لگی۔

''رضا!۔۔۔''حسین نے اسکے کندھوں پر ہاتھ رکھا تو اُس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا،کوئی خوف سا اُسکی آنکھوں میں لہرایا تھا۔

''کیا وہ جیل والی بات اتنی بڑی تھی کہ تم نے دوستوں سے الگ ہونا ضروری سمجھا؟''حسین نے نرمی سے پوچھا۔

''میں ذلیل ہو گیا تھا حسین! میں اپنی نظروں میں گر گیا تھا۔''اُس نے پہلی بار کھل کر کہا۔

''کیوں؟تمہارا تو کوئی قصور نہ تھا۔'' حسین اُسے سمجھانا چاہتا تھا۔

''ہاں! پر مجھے اُس وقت ایسا ہی لگتا تھا کہ اگر کسی کو میرے بارے میں معلوم ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟میں تو کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہوں گا۔اِس لیے میں نے سب سے الگ ہونا شروع کر دیا۔ہاں! میں بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔تم سب سے الگ ہونے کا۔اور وہ بہانہ اُس جھگڑے کی صورت مل گیا۔ حسین! میں ساری دنیا سے الگ ہو جانا چاہتا تھا۔در حقیقت میں۔۔۔۔''وہ رکا۔

''کیا؟''

''میں۔۔۔میں مر جانا چاہتا تھا۔اکیلے کہیں کسی ایسے کونے میں جا کر،جہاں کسی کو میری لاش بھی نہ ملتی۔''اُس نے آہستہ سے کہا،حسین کا دل دکھنے لگا۔جب یہ واقعہ ہوا تھا تو حسین وہ واحد شخص تھا،جسے رضا نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

اُس روز حسین نے اُسے فون کیا تا کہ اُسکے انٹر ویو کے بارے میں اُس سے پوچھ سکے۔ جوابا وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اُسے سب کہہ سنایا۔ وہ دوڑا دوڑا اُسکے پاس آیا۔ اُس روز رضا نے پہلی بار حسین کو غصّے میں دیکھا تھا۔ اُسکا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اُسکے ماموں کی دنیا تہہ و بالا کر دے۔ پر رضا نے منع کر دیا تھا۔

''میں گھر سے باہر نکلتا تھا تو محلے والے عجیب نظروں سے مجھے دیکھتے تھے، ماموں کے بچوں کی نظروں میں میرے لیے حقارت اور استہزاء ہوتا تھا۔ مجھے شرمندگی ہونے لگی تھی۔ میں نے اِس لیے خود کو سب سے الگ کرنا شروع کر دیا تھا۔''

''میں جانتا تھا رضا! اِس لیے میں نے کچھ روز تمہیں اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ تم یونیورسٹی نہیں آتے تھے، ہم سے ملتے نہیں تھے۔ میں کچھ نہیں کہتا کیونکہ میں تمہیں اسپیس دے رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم کچھ وقت اکیلے رہو اور جب واپس آؤ تو سب بھول چکے ہو۔ پر شاید میں نے غلط کیا۔ مجھے تمہیں اکیلا نہیں رہنے دینا چاہیے تھا۔'' حسین کو پچھتاوے گھیرنے لگے۔ رضا نے اُس واقعے کے بعد خود کو سب سے بہت دور کر لیا تھا۔ وہ شدید ڈپریشن کا شکار رہنے لگا تھا، راتوں کو اُسے نیند نہ آتی، پڑھائی میں دل نہ لگتا۔ دوستوں کے بہت اصرار پر اُنکے ساتھ بیٹھ جاتا تو بھی دھیان کہیں اور رہتا۔ اُن دنوں اُسکا دل کرتا تھا کہ بس خود کو ختم کر لے۔ حسین بار بار اُسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، اِس لیے اُسے کچھ وقت کے لیے اکیلا چھوڑ دیا، پر یہی اُسکی غلطی تھی۔ اکیلے رہ رہ کر وہ اور پاگل ہونے لگا۔ سوچیں اُسکا دماغ خراب کرنے لگیں، کوئی تھا ہی نہیں جو اُسے کسی تھیراپسٹ کے پاس لے جاتا، اُسکا علاج کرواتا۔ وہ اور زیادہ ذہنی دباؤ کا شکار رہنے لگا۔

''تمہاری غلطی نہیں ہے حسین! میں ہی غلط تھا۔ میرے پاس دوست تھے، اللہ نے مجھے پر خلوص دوست دیئے تھے۔ مجھے انہیں بتانا چاہیے تھا۔ شاید اس طرح میرا دل تھوڑا ہلکا ہو جاتا۔ پر جیل والے واقعے کے بعد سے مجھے لگنے لگا تھا جیسے۔۔۔ جیسے کسی نے مجھے ساری دنیا کے سامنے برہنہ کر دیا ہو۔ کوئی عزت نہیں رہی تھی میری، اور بس! سارا دن یہی سوچ سوچ کر میں اور زیادہ منفی ہو گیا۔ اور اُس رات علی نے جو کچھ میرے بارے میں کہا وہ تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا تھا۔'' اُس نے کھل کر بتایا۔

''علی نے جو جھگڑے والی رات کہا تھا کیا تم نے وہ سن لیا تھا؟'' اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں!'' اُس نے مختصر جواب دیا۔

''یار رضا!۔۔۔ تمہیں مجھے تو بتانا چاہیے تھا نا! میں کان سے پکڑ کر لاتا علی کو تمہارے پاس۔''پہلی بار حسین کو افسوس ہوا۔ کاش! وہ پوچھ لیتا۔

''نہیں حسین! مسئلہ علی نہیں ہے۔ اُس نے جو کہا، یہ حقیقت ہے کہ مجھے اُس پر بہت غصّہ آیا تھا۔ لیکن میں نے اُسی وقت اُس سے بدلا لے لیا تھا۔ میں نے جو الزامات اُس پر لگائے، وہ اُس سے کہیں زیادہ تھے جو اُس نے کہے۔ مجھے اُس سے معافی مانگنی چاہیے تھی پر میں آج تک نہیں مانگ سکا کیونکہ میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا۔ اُس روز جب ایف آئی اے آفس میں وہ مجھ پر الزام لگا رہا تھا، میں نے نہ اُسے مارا، نہ گالیاں دیں نہ اُس پر چیخا۔ غصّہ آیا تھا پر میں باز رہا، صرف اسی لیے کہ کہیں نہ کہیں میں نے بھی اُس کا دل دکھایا ہے۔ لیکن میں اپنے دوستوں سے الگ اِس لیے ہوا، کیونکہ مجھے اپنا آپ ہی برا لگنے لگا تھا۔''اُس نے آج سب کہہ دیا۔

''اور جب اگلے دن میں تم سے ملنے آیا تو تم جا چکے تھے۔ تمہارے ماموں نے کہا کہ تم اپنے ابّو کے ساتھ گئے ہو۔ میں نے اس بات پر یقین نہیں کیا۔ پر تم اُس رات کے بعد مجھے کہیں نہیں ملے رضا! کہاں چلے گئے تھے تم؟''حسین نے تھک کر پوچھا تھا۔ اس سوال کے جواب میں رضا کی آنکھوں میں ڈھیروں داستان آ کر سامنے لگی تھیں۔

''مم۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے نشہ شروع کر دیا تھا حسین!''الفاظ تھے کہ بم۔۔۔ حسین ششدر رہ گیا۔

اُس رات ایک بار پھر رضا نے اپنا آپ کھول کر اسکے سامنے رکھ دیا تھا کہ حسین ہمیشہ سے اُس کا راز دان تھا۔

----------+---------+--------

دس سال قبل، جھگڑے والی رات:

وہ سب سے الگ تھلگ رہنے لگا تھا، خصوصاً عمر سے تو باقاعدہ نظریں چرا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سب اُسے اکیلا چھوڑ دیں۔ ہمیشہ کے لیے۔۔۔

دوست اُس سے اُسکے غائب ہونے کی وجہ پوچھتے پر وہ ہر بار بیماری کا بہانہ بنادیتا۔ یہ بھی سچ تھا کہ وہ حقیقتاً بیمار رہنے لگا تھا۔ کھانا پینا کم ہو گیا تھا، کچھ کھانے کو دل ہی نہیں کرتا تھا، رات بھر جاگ جاگ کر آنکھوں تلے حلقے پڑ گئے تھے۔ اُسے اکثر بخار رہنے لگا تھا۔ پر وہ جتنا اپنی ذات سے لاپرواہی برت سکتا تھا، اتنی برت رہا تھا۔

اسی دوران صنوبر والا واقعہ ہو گیا۔ وہ براہِ راست اِس واقعے کا گواہ نہیں تھا، پر اِس حادثے نے کچھ وقت کے لیے اُسکی توجہ تکلیف دہ باتوں سے ہٹادی تھیں۔ پر اُسکے بعد مقدّم غائب ہو گیا اور اُسکے غائب ہونے پر جو ردعمل اُسکے دوستوں نے دیا، وہ سمجھ گیا تھا کہ اب یا تو یہ جھگڑا کسی بڑے جھگڑے میں تبدیل ہو گا یا پھر اُن سب کی جدائی میں۔۔۔ پہلے جھگڑے کے بعد ایک ماہ تک کسی نے کسی سے بات نہ کی، بس حسین کبھی کبھار اُس سے حال احوال پوچھ لیا کرتا تھا۔ اِس ایک ماہ وہ کچھ ذہنی سکون میں رہا، اُسکا وہ خودساختہ خوف کہ اُسکے دوستوں کو سب پتہ چل جائے گا اور وہ بھی اُسے بری نظروں سے دیکھیں گے، وہ زائل ہونے لگا۔ اور اُسے یہ یقین ہونے لگا کہ اِس خوف اور ڈپریشن کو ختم کرنے کا واحد حل یہی ہے کہ وہ ان سب کو چھوڑ دے۔ اور ایسی جگہ چلا جائے، جہاں اُسے کوئی نہ جانتا ہو۔ چاہے کسی کی گاڑی صاف کرے یا کسی کے گھر کا ملازم بن جائے، پر یہاں سے دور ہو جائے۔

جھگڑے والی رات جب عمر اِس ملک سے جانے کے لیے تیار تھا، اُس روز پہلی بار وہ تھوڑا بہت سنجیدہ ہوا۔ وہ اور حسین، عمر کو چھوڑنے باہر تک آئے تھے۔ البتہ علی اُن سب پر شدید خفا تھا۔ وہ عمر کو آخری بار خدا حافظ کہہ کر مڑے تو اُسکا فون بجنے لگا۔ کسی انجان نمبر سے فون تھا۔ حسین اندر چلا گیا اور وہ وہیں کھڑا فون سننے لگا۔

''رضا الٰہی! آپکا کل انٹرویو ہے۔ کیا آپ کل صبح آسکتے ہیں؟'' کسی کمپنی میں اُس نے درخواست بھیجی تھی، وہیں سے کال تھی۔

''ٹھیک ہے! کس وقت اور کہاں آنا ہے؟'' اُس نے پوچھا۔ پھر نام اور جگہ جاننے کے بعد اُن سے کل آنے کا وعدہ کر کے اندر کی جانب بڑھا، پر اندر کا منظر دیکھ کر اسکے قدم دروازے پر رک گئے۔

''دیکھو علی! سب کی اپنی مرضی ہے، اگر کوئی تمہارا ساتھ نہیں دینا چاہتا تو تم زبردستی نہیں کر سکتے۔ لیکن میں آخری وقت تک تمہارے ساتھ ہوں اور اگر رضا اس کیس کا حصہ ہوتا تو وہ بھی آخر تک تمہارا ساتھ دیتا۔'' حسین علی کو سمجھا رہا تھا۔

''رضا! ہونہہ۔۔۔'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔

''رضا پہلے خود کو تو سنبھال لے، جو اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا وہ کسی اور کے لیے کیا کرے گا؟''الفاظ تھے کہ پگھلا ہوا سیسہ ؟۔۔۔

رضا الٰہی اپنے دوستوں سے ایسی اُمید نہیں رکھتا تھا، اُسکے بعد اندر کیا ہوا؟ اُسے نہیں معلوم۔۔۔پر رضا زمین میں دھنس گیا۔ اُس لمحے اُسکے سارے احساسات، تمام جذبات منجمد ہو گئے۔ علی کے لہجے میں اُسے وہی حقارت محسوس ہوئی، جو اپنے ماموں، اپنے باپ اور باقی تمام لوگوں کے لہجوں میں تھی۔ وہی ذلت اُسکا مقدر بنی جو ہمیشہ سے تھی۔

نجانے اُس لمحے اُسے کیا ہوا؟ وہ اندر گیا اور پھر علی کے ایک جملے کے جواب میں اُس پر اتنے گھناؤنے الزام لگا گیا کہ جس کے بعد نجانے وہ کتنے عرصے تک خود سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

علی تو علی اُس نے نوید کو بھی نہیں بخشا، جسکا اس سارے معاملے میں سرے سے کوئی قصور بھی نہ تھا۔ لیکن نہیں! ایسا نہیں تھا کہ وہ ہوش میں نہیں تھا۔ اُس نے یہ سب جان کر کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسکے دوست اُس سے نفرت کریں اور جب وہ یہاں سے غائب ہو جائے تو وہ اُسکے پیچھے نہ آئیں۔ لیکن حسین سمجھ گیا۔۔۔ وہ اُس روز بھی سمجھ گیا کہ رضا نے یہ جان کر کیا ہے۔ پر اس وقت حسین بھی ذہنی طور پر اتنا تھک چکا تھا کہ وہ رضا کو اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ آخر وہ بھی انسان تھا، اُسکی برداشت کی بھی کوئی حد تھی۔ لیکن اُس نے غلط کیا۔ کم از کم اُس رات اُسے رضا کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔

----------+---------+--------

وہ پیدل چلتے چلتے ایک مصروف سی شاہراہ پر آ گیا۔ گاڑیوں کا شور اُسکے اندر کا شور کم کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ فلائی اوور کے نیچے بنے فٹ پاتھ پر بہت سے نشئی اور فقیر سوئے پڑے تھے، وہ ہر شے کو نظرانداز کرتا پاس رکھی بینچ پر آ بیٹھا۔ گاڑیاں پاس سے تیزی سے گزر رہی تھی، ہر ایک کی زندگی دوڑ رہی تھی پر اُسکی جیسے رک چکی تھی۔ چوکیدار نے اُسکے منہ پر پیسے مارے، ماموں کے بیٹے نے اُسکا مذاق بنایا، پولیس والوں نے اُسے مارا اور آج علی نے اُسکی ذات کو نشانہ بنایا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ کیونکہ اُسکا باپ اُسے یتیموں کی طرح چھوڑ گیا تو ساری دنیا کو ہمت ہو گئی تھی اُس پر بات کرنے کی؟ اُس پر کیچڑ اچھالنے کی؟

اُسے نہیں پتہ وہ وہاں کیوں تھا؟ وقت گزرتا گیا اور گاڑیوں کا شور مدھم پڑتا گیا۔ وہ وہاں سے نہیں اُٹھا۔ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ نجانے رات کتنی ہو چکی تھی؟ کسی نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کیا تو وہ چونکا۔ نظریں اُٹھا کر دیکھا تو سب سے پہلے بدبو کا ایک بھبکا نتھنوں سے ٹکرایا۔

''کیا ہے؟ کون ہو تم؟'' رضا نے اُس میلے کچیلے، بدبودار وجود والے شخص کو بیزاری سے دیکھا۔

''تمہیں نیند نہیں آرہی؟ یہ لو۔۔۔اس سے آجائے گی۔۔۔'' وہ تھیلے میں لپٹی کوئی شے اُسکی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ رضا کا دماغ جاگ اٹھا، وہ اُسے نشہ پیش کر رہا تھا۔ اُس نے جھٹکے سے اُسکا ہاتھ پیچھے کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

''دور رہو مجھ سے۔۔۔'' وہ اس چرسی کو غصّے سے کہتا جانے کے لیے مڑ گیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟ بات تو سنو!'' چرسی پیچھے سے بولا پر اُسکی اتنی ہمت نہ تھی کہ رضا کے پیچھے آسکتا۔

وہ تیز تیز چلتا کسی رہائشی علاقے کی طرف آگیا، جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ چرسی اُسکا پیچھا نہیں کر رہا تو ایک خالی عمارت کے سامنے خاموشی سے بیٹھ گیا۔ وہ گھر جا سکتا تھا، پر نہیں گیا۔ خاموش اور تاریک عمارت کے سامنے بیٹھے اُس نے پوری رات گزار دی۔ فجر کی اذان نے صبح کی نوید بھی سنادی پر وہ وہیں بیٹھ رہا۔ وہ تھک گیا تھا۔۔۔اور تھک جانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ سونا چاہتا تھا۔۔۔بلکہ وہ زندگی سے تھک گیا تھا۔۔۔جینے سے تنگ آگیا تھا۔

صبح ہوئی تو جیب میں رکھا موبائل بجنے لگا، بھلا کس کو اسکی فکر ہونے لگی تھی؟ اُس نے فون نکال کر دیکھا تو جس جگہ اُسے انٹرویو کے لیے جانا تھا۔ اُس جگہ سے فون آیا تھا۔ اُس نے فون نہیں اُٹھایا۔ کچھ دیر بعد فون دوبارہ بجا، اس مرتبہ حسین فون کر رہا تھا۔ کافی دیر وہ اسکرین کو دیکھتا رہا۔ پھر پوری قوت سے موبائل پاس بہتے نالے میں پھینک دیا۔ اُسے اس دنیا کے کسی فرد سے رابطہ نہیں رکھنا تھا۔ کسی سے بھی نہیں۔۔۔۔

صبح دوپہر میں تبدیل ہو گئی اور دوپہر شام میں۔۔۔پر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ وہاں بیٹھ کر اور اکیلے رہ کر جو سکون اُسے مل رہا تھا، وہ کسی کے ساتھ رہ کر بالکل نہیں مل سکتا تھا۔ شام ہوئی تو بھوک ستانے لگی۔ وہ چوبیس گھنٹوں سے بھوکا پیاسا بیٹھا تھا، اور پچھلے چوبیس گھنٹوں سے وہ سویا بھی نہیں تھا۔ طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں رہتی تھی اوپر سے بھوک کی وجہ سے حالت اور عجیب ہونے لگی تھی۔

ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ سڑک کے پار ایک گاڑی آکر رکی، سیاہ رنگ کی بڑی اور خوبصورت سی گاڑی دور سے ہی اپنی جاہ و حشمت کا پتہ دیتی تھی۔ اُس گاڑی کا وہاں آنا حیران کن نہیں تھا بلکہ اُسکے آتے ہی گاڑی کے آس پاس مختلف فقیروں کا جمع ہونا حیران کن تھا۔ وہ نجانے کہاں کہاں سے نکل کر آرہے تھے؟ کل سے رضا یہاں تھا، تب تو کوئی ذی روح نظر نہ آئی تھی۔ یا شاید وہ اپنے آس پاس سے ٹھیک ٹھاک بے خبر بیٹھا تھا۔ گاڑی سے کوئی شخص اُترا، کلف لگے سفید شلوار کرتے میں، چہرے پر سنجیدہ سی مسکراہٹ سجائے۔ ساتھ ایک دو اور لوگ تھے، حلیے سے ملازم لگتے تھے۔ گاڑی سے اتر کر اُس نے ڈگی کھولی تو ایک دیگ رکھی نظر آئی۔

''اوہ! تو اس لیے یہ لوگ یہاں جمع ہو رہے تھے؟'' اُس نے سوچا۔ آدمی نے لوگوں کو ایک قطار میں جمع کیا اور تھیلیوں میں کھانا ڈال ڈال کر انہیں باری باری دینے لگا۔ رضا خاموشی سے دیکھتا رہا۔ جسے کھانا مل جاتا وہ وہیں کہیں آس پاس بیٹھ جاتا اور کھانا شروع کر دیتا۔

''سن!۔۔۔'' کسی نے اُسکا کندھا ہلایا۔

''کیا؟'' رضا نے نا سمجھی سے پاس کھڑے فقیر کو دیکھا۔

''تُو نہیں کھائے گا؟'' اُس نے تھیلی میں رکھی بریانی اُسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔ رضا کو پہلی بار برا لگا۔

''تمہیں میں حلیے سے لنگر کھانے والا لگتا ہوں؟'' اُس نے سخت تاثرات کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں! حلیے سے تو، تُو کسی بڑے گھر کا لگتا ہے۔ پر کل رات سے یہاں بیٹھا ہے، بھوک نہیں لگی تُجھے؟'' اُسکے سوال پر وہ حیران ہوا؟ وہ لوگ رات سے یہاں تھے، اور اُسے دیکھ رہے تھے؟ کہاں چھپے تھے بھلا وہ؟

''نہیں! مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور وہاں سے بھی چل پڑا۔ فقیر کندھے اُچکاتے وہیں بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ رضا نے رک کر، ایک نظر اُسے دیکھا۔ وہ تھیلی زمین پر رکھے اُسی میں سے کھا رہا تھا۔

''یہ کیسی نیکی ہے؟ کیا کھانا کسی ڈبّے میں؟ یا کسی پلیٹ میں نہیں دیا جا سکتا؟ اِس استحصال کو لوگ نیکی کیسے کہہ لیتے ہیں؟'' اُس نے سوچا اور واپس مڑ گیا۔ دل کچھ مزید دکھ گیا۔ یہ دنیا کچھ مزید بری لگنے لگی۔ کمزوری کے سبب زیادہ چلنے کی ہمت نہ تھی تو تھک کر پھر کسی فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ سڑک کے پار کوئی فوڈ سٹریٹ تھی، مختلف قسم کے ہوٹل اور ریسٹورانٹ نظر آرہے تھے۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے

پوری فضا مسحور کن کی ہوئی تھی۔ مغرب ہوتے ہی وہاں کی روشنیاں اور رونقیں عروج پر پہنچ گئی تھیں۔ لوگ دور دور سے فقط صرف کھانے پینے کے لیے آرہے تھے۔ وہ خاموشی سے اُنہیں کھانا کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سنا تھا اِس شہر میں کوئی غریب بھوکا نہیں سوتا۔ ہاں! غریب تو واقعی بھوکا نہیں سوتا۔ وہ بیچارہ تو اپنی عزت نفس قربان کر کے بھیک میں ملا کھانا کھا لیا کرتا ہے۔ پر سفید پوش؟ سفید پوش کیا کرے؟ رضا کو کبھی اچھا کھانے کی چاہ نہ رہی۔ پر اللہ کے کرم سے وہ کبھی بھوکا بھی نہیں سویا تھا، سوائے کل رات کے۔

رات ہوتے ہوتے حالت مزید غیر ہونے لگی، اس سے پہلے کے وہ اپنے نفس کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی کے آگے ہاتھ پھیلا لیتا، اُس نے وہاں سے اٹھنے میں ہی عافیت جانی۔ اپنا بٹوہ وہ ماموں کے گھر کے کیبن میں ہی چھوڑ آیا تھا، بٹوہ پاس ہوتا تو کم از کم ایک ہفتے تو وہ گزارا کر لیتا بھلے سے ایک وقت کھانا کھاتا۔

خود کو گھسیٹتے وہ نجانے کب ماموں کے بنگلے کے سامنے آ کھڑا ہوا؟ گھر کی تمام بتیاں روشن تھیں۔ اندر یقیناً سب رات کا کھانا کھا رہے ہوں گے۔ کسی کو اُسکی فکر بھی نہیں ہو گی۔

''جو روٹی مجھے اس گھر میں ملتی ہے، وہ بھی تو ذلت کی ہی ہے۔ اور ذلت کی روٹی کھانے سے اچھا ہے کہ میں بھیک میں ملا کھانا کھا لوں۔''

وہاں کھڑے اُس نے آخری فیصلہ یہی کیا اور مڑ گیا۔ اُس روز کے بعد وہ دوبارہ اِس دروازے پر نہیں آیا۔

مایوسی کفر ہے۔۔۔

اور رضا اُس وقت مایوسی کی تمام حدیں پار کر چکا تھا۔۔۔

اگر جو وہ مایوسی سے باہر نکل کر تھوڑا ذہن استعمال کرتا، تو اُسے اپنے سامنے ایک روشن مستقبل نظر آتا۔ ایک اچھی نوکری اُسکی میز پر رکھی تھی، کچھ عرصے صبر کر کے اگر وہ ذلت کی روٹی کھا بھی لیتا تو کونسا ساری زندگی اُس نے وہیں رہنا تھا؟ پر۔۔۔

اُس نے مایوسی کو چنا۔۔۔

اُسے خدا کے کرم پر بھروسہ نہیں تھا۔۔۔

اُسے رب کی جزا پر یقین نہیں تھا۔۔۔۔

اُس نے سوچا کہ بس زندگی ختم۔۔۔

اور مایوسی اسی لیے کفر ہے۔۔۔۔

----------+---------+--------

چوبیس گھنٹے چھتیس گھنٹوں میں بدل گئے۔اُسکی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔وہ دوبارہ اُسی خالی عمارت کے پاس آبیٹھا۔آج پتہ نہیں کہاں سے اور بہت سے دیگر فقیر بھی اُسے وہاں نظر آنے لگے تھے؟شام ہوئی تو وہاں پھر ایک گاڑی آرکی۔پر آج ناصرف گاڑی مختلف تھی بلکہ اُس گاڑی سے اُترنے والا بھی مختلف تھا۔اُس نے بھی وہی کیا جو کل والے شخص نے کیا تھا۔معلوم ہوتا تھا لوگ اس جگہ اکثر لنگر دینے آتے ہیں۔ فقیر آس پاس سے اُٹھ اُٹھ کر گاڑی کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔اُسی لمحے رضا نے کچھ ایسا کیا،جو شاید اُسکے تصور میں بھی کہیں نہ تھا۔کل جس فقیر نے اُسے کھانے کی پیشکش کی تھی،رضا نے اُسکا بازو پکڑ کر روک لیا۔

''کیا ہے؟دیکھ نہیں رہے،کھانا ختم ہو جائے گا۔''فقیر اُسکے روکنے پر جھنجھلایا۔

''مم۔۔۔۔مجھے۔۔۔۔مجھے بھی۔۔۔''الفاظ ادا کرنا مشکل تھا۔''مجھے بھی تھوڑا کھانا لادو۔''اُس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں جاتا۔۔۔وہ ایک بندے کو ایک ہی تھیلی دیتا ہے۔جاؤ!جا کر خود لو۔''فقیر ہاتھ چھڑاتا تیزی سے قطار میں جالگا۔رضا بے بس ہو گیا۔کیسے لوگ تھے؟نیکی بھی کرتے تھے اور گنتی بھی۔۔۔بھوکوں کو کھلاتے بھی تھے اور نوالوں کا حساب بھی رکھتے تھے۔

''آجا آجا!کھانا ختم ہو جائے گا۔''فقیر نے دور سے اُسے آواز دیکر پکارا،تو اُس نے پہاڑ جیسا پتھر اپنے دل پر رکھا اور خود کو گھسیٹتا قطار کی طرف بڑھنے لگا۔

رضا؟وہ پہلے خود کو تو سنبھال لے

علی کی استہزائیہ آواز کانوں میں گونجی۔خود کو گھسیٹتے گھسیٹتے قطار تک پہنچا۔وہ پہنچنے والوں میں آخری تھا۔لہٰذا اُسکی باری بھی آخر میں آنی تھی۔

تم وہ لیکر کیا کرو گے ؟اُنکے پاس جا کر،اپنی غربت کے رونے رو کر اُن سے بھیگ مانگو گے ؟

قطار میں کھڑا رضا الٰہی، جسے اُسکی ماں نے نوالے بنا بنا کر ہاتھوں سے کھلائے تھے۔آج صرف بھیک میں ملے کھانے کا منتظر تھا۔

تمہارا باپ تمہیں نہ تو گلے لگائے گا اور نہ ہی تمہیں دیکھ کر اُسکا دل بھر آئے گا۔

اسکی باری آئی تو کسی نے اُسے تھیلی پکڑا دی۔اُس نے کانپتے ہاتھوں سے تھیلی کو کسی جھولی کی طرح اُس شخص کے آگے پھیلایا۔ سر کچھ مزید جھک گیا۔

اوہ ہیرو!پیسے تو لیتے جاؤ۔یہ کم ہیں کیا؟

چوکیدار کا استہزاء کرتا لہجہ یاد آیا۔دینے والے نے کھانا پھر بھی عزت سے دیا تھا،منہ پر مارا نہیں تھا۔کھانا لیکر اُس نے تھیلی کا منہ بند کیا اور پلٹ گیا۔

لڑکا میرے رشتے دار کا بیٹا ہے۔پیسے ویسے مانگنے آیا ہو گا،تمہارے پاس ابھی کچھ نقد ہے تو اُسے دے کر چلتا کرو۔مجھ سے بعد میں لے لینا۔

کون تھا اسکا دنیا میں ؟ماں ہوتی تو شاید اُسکے خاطر زندہ رہ لیتا۔پر اب کس کے لیے زندہ رہے ؟اپنے لیے تو ہر گز نہیں۔۔۔

آج اپنی اوقات اچھے سے سمجھ آگئی ہو گی تمہیں؟

قریب بینچ کے پیچھے چھپ کر، کہ دکھیں نیا دیکھ نہ لے،اُس نے زمین پر تھیلی رکھ کے کھولی۔اُسکے اندر ہاتھ ڈالا اور پہلا نوالہ نکال کر منہ میں ڈالا۔دل بھر آیا،آنسو بہہ نکلے۔

”عزت راس نہیں آرہی تھی نہ تیرے کو؟“کانسٹیبل نے جوتے سمیت اُسکے منہ پر پاؤں رکھا،

دوسرا نوالہ منہ میں ڈالا تو سسک اٹھا۔پر بھوک انسان سے کیا کچھ نہیں کرواتی۔ابھی چند لقمے ہی کھائیں تھے کہ کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا تو کھانا دینے والا پاس کھڑا اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔وہ یقیناً اُسکے حلیے پر حیران ہو گا۔وہ شرمندہ ہوا، مگر تھوڑا سا۔ بھوک نے فلحال ساری شرمندگی مٹا دی تھی۔

''تم۔۔۔ تم کون ہو؟ کسی اچھے گھر کے لگتے ہو۔''اُس آدمی نے اُسے دیکھ کر حیرت سے کہا۔اور بس! رضا نے کھانا وہیں چھوڑا اور کھڑا ہوا۔

''کیا ہوا؟ کھانا کیوں نہیں۔۔۔۔''آدمی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ وہاں سے بھاگ گیا۔

''ارے رکو!۔۔''آدمی نے پیچھے سے اُسے آواز دی۔پر وہ نہیں رکا۔مزید کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے۔۔۔مزید کسی کا احسان نہیں۔۔۔۔یہ دنیا احسان کر کے جتاتی ہے۔

اور یہ دنیا ہمدردی بھی اچھے لباس میں لپٹے، بیچارے سے کرتی ہے۔ورنہ وہاں اور بھی تو لنگر کھانے والے تھے۔

وہ شخص کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔پر یہ اُسکی رضا سے آخری ملاقات نہیں تھی۔

----------+---------+--------

آج وہ پھر سے اُسی فلائی اوور کے نیچے آ بیٹھا تھا۔وہ دنیا سے چھپ جانا چاہتا تھا،اپنی شناخت تک مٹا لینا چاہتا تھا۔مرنا چاہتا تھا پر مرنے کے لئے بھی ہمت نہیں تھی۔

''سن!''وہ چرسی آج پھر اُسکے پاس آ گیا۔رضا نے آج پھر اُسے نظرانداز کیا تھا۔

''یہ دنیا تجھے سکون سے رہنے نہیں دے گی۔ ہمیں بھی بڑا تنگ کیا دنیا نے۔۔۔''چرسی اُسکے پاس ہی آ بیٹھا۔

''پھر ہمیں یہ مل گئی۔''اُس نے چرس کی تھیلی اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔''بہت سکون ہے اس میں، سب بھلا دیتی ہے یہ۔۔۔نہ بھوک پیاس لگتی ہے اور نہ دنیا نظر آتی ہے۔بس میں ہوتا ہوں میری دنیا۔تُو بھی لے کر دیکھ۔''چرسی نے چرس بھری سگریٹ اُسکے حوالے کی۔ اُس نے کچھ نہ کہا۔

''چل کوئی بات نہیں! جب دل کرے تب پی لینا۔''وہ سگریٹ اُس کے پاس رکھ کر ہی اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔رضا نے دیکھا کہ کچھ دیر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی چادر کے اندر چھپ کر چرس سونگھتا رہا، پھر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

وہ نجانے کتنی راتوں کا جاگا ہوا تھا؟اُنہیں سوتا دیکھ کر اُسے رشک آیا۔

بہت سکون ہے اس میں، سب بھلا دیتی ہے یہ۔۔۔نہ بھوک پیاس لگتی ہے اور نہ دنیا نظر آتی ہے۔

رضا نے سگریٹ کو دیکھا، پھر اُن سب کو، دماغ سن ہو رہا تھا، اُسکے اندر کوئی شے اُسے یہ احساس دلا رہی تھی کہ اُسے یہ لے لینی چاہیے۔ پھر اُس نے آس پاس دیکھا، رات بہت ہو چکی تھی، اس لیے لوگ اکا دکا ہی نظر آ رہے تھے اور ہوتے بھی تو کونسا اس شہر میں کسی کو کسی سے مطلب تھا؟ رضا نے خاموشی سے چرس بھری سگریٹ اٹھائی اور پاس پڑی ماچس سے اُسے جلا لیا۔

پھر نفس جیت گیا۔۔۔

شیطان جیت گیا۔۔۔

اور بندہ ہار گیا۔۔۔۔۔

اور اس ہارنے میں بندے کا ہی نقصان ہے۔۔۔۔

----------+---------+--------

رات بھر خواب میں ماں کو دیکھتا رہا، باپ کی محبت سمیٹتا رہا، عیاشی کی زندگی گزارتا رہا۔ وہ دنیا واقعی خوبصورت تھی۔ اس کی من پسند دنیا ۔۔۔

صبح اُٹھا تو سر بھاری تھا، اُسے لگا کہ صبح ہو رہی ہے پر در حقیقت، اُس بینچ پر سوئے ہوئے اسے رات سے اگلی شام ہو چکی تھی۔

''کیا ہوا تُجھے؟'' اُسی چرسی نے پوچھا۔

''سر درد کر رہا ہے۔'' رضا نے پہلی بار جواب دیا۔

''پہلی بار لی ہے نا؟ چل پریشان نہ ہو؟ یہ لے اور پی۔۔۔ درد چلا جائے گا۔'' اُس نے سگریٹ اُسکی جانب بڑھائی۔

''اِس سے۔۔۔ درد چلا جائے گا؟'' اُس نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ لیتے پوچھا۔ چرس بھری سگریٹ۔۔۔

''ہاں!۔۔۔''اور رضا نے وہ حرام شے دوبارہ منہ سے لگالی۔اور ایک بار پھر دنیا ومافیہا سے بے گانہ ہو گیا۔اور یوں یہ سلسلہ چل نکلا، صبحیں شاموں میں، اور شامیں راتوں میں بدلتی گئیں اور وہ جگہ اُسکا مسکن بن گئی۔جو سکون اُسے نشے میں ملا تھا، وہ کہیں نہیں تھا۔نشے کی حالت میں وہ اپنی من چاہی زندگی جی کے آجاتا، وہ اپنی دنیا میں ہوتا۔اِس دنیا سے اُسے کوئی غرض نہ رہتی تھی۔کھانا کوئی دے جاتا تو کھالیتا، ورنہ نشہ کافی تھا۔

دو ماہ میں اسکی داڑھی بڑھتی چلی گئی، بال بے ترتیب اور حلیہ بدترین ہو گیا۔اپنے لباس پر اُڑتی دھول بھی نہ پڑنے دینے والا رضاالٰہی، آج دھول مٹّی سے اٹا وجود ہو گیا۔پاکی ناپاکی کا کوئی خیال اُسے نہ رہا، ماضی بھی اُسے یاد نہ رہا اور جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا پر نشہ اُسے وہ سکون دینے لگا، جو دنیا میں کسی نے نہ دیا تھا۔

دو مہینے اسی طرح گزر گئے، ایک رات اُسے نشہ نہ ملا۔جو فقیر چرسی، اسے روز نشہ فراہم کرتا تھا، آج وہ بھی اُس کے پاس نہ آیا۔رضا لڑکھڑاتے قدموں اور ہلتے ہوئے دماغ کے ساتھ اُسے ڈھونڈتا ہوا پہنچا۔

''اے۔۔۔''رضا نے اُسے ہلایا، پر اُس نے نہ سنا۔

''اے۔۔۔ سن۔۔۔''اُس نے اُسے لات ماری۔

''کیا ہے؟''چرسی نے بیزاری سے کہا۔

''سیگریٹ دے مجھے۔۔۔''اُس نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔

''کیوں؟ کیوں دے تیرے کو؟ مفت عیاشی کروادی نا اتنے عرصے؟ جا جاکر پیسے لیکر آ، پھر خریدنا مجھ سے۔۔۔''چرسی نے منہ پھیر لیا۔

''دے مجھے۔۔۔ ورنہ ماروں گا۔''رضا نے اُسکے بال کھینچے، پر اُسکو کوئی فرق نہ پڑا۔

''دے نہ۔۔۔''پھر رضا نے اُسکو مارنا شروع کر دیا۔اُس نے چند ہی مکّوں میں اُسکو گرا کر بیہوش کر دیا۔پھر اُسکی جیب سے چرس اور پیسے دونوں نکال لئے۔

اُسکے بعد وہ وہ ایک کنارے آ گیا، اِس سے پہلے کہ وہ چرس پیتا اسے خلیل نظر آیا۔ خلیل وہ شخص تھا، جو ان چرسیوں کو چھپا کر چرس بیچتا تھا۔ رضا جلدی سے اٹھ کر اُسکے پاس آیا اور چند سو کے نوٹ جو اُس نے ابھی ابھی اپنے ساتھی سے چرائے تھے، خلیل کو دیے۔

''یہ کیا ہے ؟ اتنے کم پیسوں میں نہیں آتا یہ۔۔۔'' خلیل نے پیسے دیکھ کر کہا۔

''جتنا آتا ہے اتنا دے دے۔۔۔'' رضا نے کہا۔ خلیل نے منہ بناتے ہوئے تھوڑی سی چرس ایک کاغذ میں لپیٹ کر اسکے حوالے کی۔ اُسکے پاس اب دو دن کی چرس تھی۔ اُس نے جیب میں چھپا لی۔

اگلے روز جب اسکا نشہ اُترا تو وہ کھڑا ہوا۔ پاس بنے نل کا گندا پانی منہ لگا کر پیا۔ ابھی پی کر مڑا ہی تھا کہ سامنے وہی چرسی اپنے ساتھ چار عدد مزید ساتھی لیکر اُسکا راستہ روکے کھڑا تھا۔

''کیا ہے ؟'' رضا نے پوچھا۔

''پیسے دے مجھے۔۔۔'' اُس چرسی نے قریب آتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس نہیں ہے۔'' رضا کہتے ہوئے جانے لگا۔ اُس نے بازو پکڑ کر روک لیا۔

''چھوڑ مجھے۔۔۔'' رضا نے بازو چھڑوانا چاہا پر مزید دو تین چرسیوں نے اُسے پکڑ لیا۔

''چھوڑ۔۔۔'' رضا چیخا پر اُس چرسی نے اُسکی جیب سے کل کی خریدی ہوئی چرس نکال لی۔ باقی چرسیوں نے جو چرس دیکھی تو اُسے چھوڑ کر وہ بھی اپنے ساتھی کے پاس آئے۔ رضا گرتے پڑتے اُسکے قریب پہنچا کہ اسکے ہاتھ سے چرس چھین کر بھاگ سکے لیکن چرسی نے اسکا ارادہ بھانپ کر چرس کا ساشے دوسرے کی طرف اچھال دیا۔ دوسرے نے سرعت سے اُسے پکڑا۔

''اے۔۔۔ یہ میری ہے۔۔۔'' رضا لڑھکتے ہوئے اُسکے پاس آیا تو اُس نے ہنستے ہوئے چرس تیسرے کی جانب اچھال دی۔

''آ لے۔۔۔ لے آ کر!'' تیسرا چرسی اُسکو ساشے دکھا کر ہنستا رہا۔

''دے مجھے۔۔۔ دے یہ میرا ہے۔۔۔'' وہ پوری قوت مجتمع کر کے چیخا تھا۔ لیکن اُس نے بھی وہ کسی اور کی طرف اچھال دیا، وہ سب اُسکا مذاق اُڑاتے اُسکے ساتھ کھیلنے لگے۔ رضا کا دماغ گھومنے لگا۔ آس پاس گزرتے لوگوں نے کوئی توجہ نہ دی کہ یہ تو ان چرسیوں کا روز کا

معمول تھا۔اُسی لمحے نجانے اُس کے لاغر وجود میں کہاں سے اتنی طاقت آئی کہ اُس نے کس کے ایک مکا پہلے والے چرسی کو جڑ دیا، وہ لڑکھڑاتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔اِس منظر کو دیکھ کر باقی چرسیوں نے اُسے مارنا شروع کر دیا۔ مار کھاتا رضا بھی وہیں گر پڑا، وہ سارے مل کر اُس پر پل پڑے تھے، وہ بے ہوش ہو گیا۔

''چھوڑو اسے۔۔۔۔ہٹو یہاں سے۔۔۔''کسی بھلے آدمی نے پتھر مار کر انہیں وہاں سے ہٹایا تو وہ سب بھاگ نکلے۔ پھر وہ بھلا مانس رضا کی جانب بڑھا۔

''جانے دیں بھائی! یہ سب چرسی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔رات کو سارے ساتھ بیٹھے ہوں گے۔''قریب ہی ایک نرسری کا مالی کھڑا تھا،اُس نے آدمی سے کہا تو وہ رک گیا۔ پھر کندھے اُچکاتا وہاں سے چلا گیا۔رضا وہیں گرا پڑا رہ گیا۔

اُس نے خدا پر بھروسا کرنے کے بجائے اپنے لیے خود یہ زندگی چنی تھی۔۔۔۔

----------+---------+--------

مالی نے صحیح کہا تھا۔اگلے روز وہ سارے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔البتہ آج بھی رضا کو نشہ نہیں ملا تھا۔نشہ نہ ملنے کی وجہ سے اُسکی حالت غیر ہونے لگی تھی۔اتنے میں ایک لڑکا اُسکے پاس آیا۔

''پیسے چاہییں ؟''اُس نے رضا سے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔ہاں ہاں۔۔۔چاہیے۔۔۔چاہیے۔۔۔''رضا نے جلدی سے کہا۔

''یہ بوری پکڑ اور میرے ساتھ راستے سے ردّی چن لے۔۔۔پھر اسکو بیچ کر دونوں پیسے کمائیں گے اور پھر نشہ خریدیں گے۔ کرے گا یہ کام؟''اُس نے پوچھا۔

''ہ۔۔۔ہے۔۔۔ہاں ہاں۔۔۔کروں گا۔۔۔کروں گا نا۔''اُس نے سر ہلا کر کہا تو لڑکے نے اُسے ایک بوری پکڑائی اور اپنے ساتھ لیکر چل پڑا۔یہ دونوں راستے سے کچرے میں سے کچھ ردیاں اور سوکھی روٹیاں چنتے جاتے۔رضا سے چلا نہ جاتا،لباس سے بدبو کا بھبکا اٹھتا، آنکھیں دھندلانے لگتی پر وہ بس نشے کی طلب میں خود کو گھسیٹتا رہتا۔شام تک انہوں نے اچھی خاصی روٹیاں اور ردیاں جمع کر لیں۔

''چل اب اسے بیچ کر آتے ہیں۔''لڑکا اُسے لیے ایک چوک پر آ گیا۔ وہ ایک مصروف شاہراہ کی سڑک تھی۔

''تُو یہاں بیٹھ، میں یہ مال بیچ کر آتا ہوں۔''لڑکا اُسکو چوک پر بیٹھنے کا کہہ کر سامنے دکان میں چلا گیا۔ رضا نے اُسکو اپنی بوری بھی دے دی تھی۔ اب وہ بیٹھا اُسکے آنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اُسکی نظریں ایک آدمی پر پڑیں، یہ آدمی چوک پر پرندوں کے کھانے کے لیے بھر بھر کر پکے ہوئے سفید چاول ڈال کر گیا تھا۔ جیسے ہی وہ آدمی وہاں سے گیا رضا جلدی سے اٹھ کر اُس جگہ آیا، جہاں وہ آدمی چاول ڈال کر گیا تھا۔ وہ پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور فٹ پاتھ سے چاول اُٹھا اُٹھا کر منہ میں ڈالنے لگا۔ بھوک میں یہ چاول بھی غنیمت لگ رہے تھے۔

مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال نی

دھواں دُھکھے میرے مرشد والا جاں پھولاں تے لال نی

سُولاں مار دیوانی کیتا برہوں پیا ساڈے خیال نی

دُکھاں دی روٹی، سُولاں دا سالن آہیں دا بالن بال نی

وہ بڑی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا کہ اُسکی نظریں دکان سے نکلتے اپنے ساتھی پر پڑیں، وہ اُس سے نظریں بچا کر بھاگنے کے چکروں میں تھا۔ رضا نے ہاتھ میں پکڑے چاول پھینکے اور تیزی سے اُٹھ کر اسکی جانب بھاگا، بھاگتے ہوئے اُسے سڑک سے گزرتی گاڑیوں کا خیال بھی نہ تھا، وہ چلتی گاڑیوں کے نیچے آتے آتے بچا۔ کتنے ہی لوگوں نے رک کر اُسے گالیاں دی تھیں۔ پر وہ اُس لڑکے کے پیچھے دوڑ رہا تھا جو اُسکے پیسے لیے بھاگ رہا تھا۔ کافی مشکلوں سے ہی صحیح لیکن رضا نے اُسے جا لیا پھر اُسے مار پیٹ کر اُس سے اپنے پیسے چھینے۔ پیسے چھیننے کے بعد اُس نے انہیں گننا شروع کیا۔

''سو۔۔دو سو۔۔۔سو۔۔۔''اُسے گنتی بھولنے لگی۔ اُس نے ذہن پر زور ڈالا کہ دو سو کے بعد کیا آتا ہے پر یاد نہیں آیا۔

''سو۔۔۔سو۔۔۔''وہ پھر گننے کی کوشش کرنے لگا۔ کہ ایک چھوٹا سا پتھر اُسکے سر پر آ کر لگا۔ اُسکا سر جھنجھنا اُٹھا۔ مڑ کر دیکھا تو کچھ شرارتی بچے کھڑے تھے۔

''پاااگل۔۔۔۔پاااااگل۔۔۔''بچے اُسے دیکھ کر تالیاں پیٹنے لگے۔

''بھا گو یہاں سے۔۔۔'' رضا نے چیخنے کی کوشش کی۔

''دیکھو دیکھو! پاگل۔۔۔ دیکھو یہ پاگل ہے۔'' بچے ایک دوسرے کو بتا کر ہنسنے لگے۔

''میں پاگل نہیں ہوں۔۔۔۔ نہیں ہوں۔۔۔'' اُس نے جنونی انداز میں کہتے وہی پتھر اُٹھایا اور فضا میں بلند کیا، بچے ہنستے ہوئے بھاگنے لگے، رضا کا ارادہ انہیں مارنے کا تھا کہ اُسی لمحے بچوں کے قہقہوں نے اسکا شعور لمحے بھر کو جگایا۔

''بچے۔۔۔'' اُسکا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا۔ بچے، پیارے پیارے ہنستے مسکراتے بچے۔۔ ذہن میں کوئی یاد سمانے لگی۔ وہ ڈبہ جس میں وہ بچوں کے لئے پیسے اکٹھے کرتا تھا۔ تا کہ اُنکے لیے گھر بنائے۔ وہ سب کہاں گیا؟ وہ کہاں کھڑا تھا؟ کیوں کھڑا تھا؟

پر اُسی لمحے، اُسکی نظریں دور کھڑے خلیل پر پڑیں اور اُسکا شعور واپس سو گیا۔ وہ پتھر زمین پر پھینک کر جلدی سے خلیل کے پاس گیا۔

''پیسے۔۔۔ پیسے ہیں۔۔۔ میرے پاس۔۔۔'' اُس نے سارے نوٹ جلدی سے خلیل کے سامنے کر دیئے۔

''ارے واہ! کہاں ہاتھ مارا ہے آج؟'' خلیل خباثت سے بولتا ہنسا۔ پھر ایک پیکٹ میں بھری چرس اور کچھ سگریٹ اُسکے حوالے کر دیں۔ رضا اُسے لیے آج ایک تنہا گوشے میں آ گیا کہ آج اُسکا نشہ کوئی چھین نہ لے۔

----------+---------+--------

کچھ دن اُس نے اُسی چرس پر گزارا کیا، کچرا چننے والا لڑکا بھی دوبارہ نہیں آیا۔ جب نشہ ختم ہو گیا تو رضا دوبارہ بوری اُٹھا کر چل پڑا، اس بار اُسکے لاغر وجود میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ گلیوں گلیوں پھرتا لہٰذا ایک ہوٹل کے سامنے بیٹھ گیا۔ فٹ

پاتھ پر بیٹھے رضا کو فقیر سمجھ کر کتنے ہی لوگ پیسے دینے لگے، ہوٹل میں آنے والوں، اور مہنگا ترین کھانا کھانے والوں کے پاس دینے کے لئے بس چند سکے ہی تھے۔ وہ بھی پھینک پھینک کر اُسکے سامنے جا رہے تھے۔ وہ ہاتھوں سے ایک ایک سکّہ اٹھا کر دیکھتا پھر اُسے جیب ڈال لیتا۔ وہ بڑے انہماک سے سکوں پر سکے اکھٹے کر رہا تھا کہ کسی نے اُسکی کمر پر زوردار لات ماری۔ اُس نے بلبلا کر دیکھا تو دو چار پیشہ ور بھکاری وہاں کھڑے تھے۔

''اے! یہ ہماری جگہ ہے۔ تُو کس سے پوچھ کر آیا یہاں؟'' ایک بھکاری، جس نے ہاتھ کو اندر موڑ کر خود کو معذور بنایا ہوا تھا بولا۔ رضا نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا، کچھ دیر اُنہیں دیکھتا رہا پھر چہرہ واپس جھکا دیا۔

''ابے او! سمجھ نہیں آئی کیا؟ یہ ہمارا علاقہ ہے، چل دے یہ پیسے۔۔۔'' ایک نے آگے بڑھ کر اُس سے پیسے چھیننے چاہے۔

''نہیں دوں گا۔۔۔۔ یہ میرے ہیں۔'' رضا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کیا۔

''دے اِدھر۔۔۔''

''نہیں دوں گا۔'' وہ اُنکو دھکا دیکر اُٹھا اور بھاگنے کے لیے دوڑا ہی تھا کہ کسی سے ٹکرا کر بری طرح گرا۔ جس شخص سے وہ ٹکرایا تھا اُس نے جھک کر اُسے کندھوں سے تھاما اور اُٹھایا۔ رضا کی حالت غیر تھی، وہ وہیں بیٹھ کر اونگھنے لگا۔

''تم۔۔۔؟'' آنے والے نے حیرت سے اُسے دیکھا تھا۔ اور رضا وہیں بے دم ہو کر گر پڑا۔

اسکی ماں کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آ گیا تھا۔۔۔۔

----------+---------+--------

Once an addict, always a recovering addict

(ایک بار نشہ کرنے والا تاعمر نشے سے لڑتا رہتا ہے)

''اس بات کا مطلب؟'' ایڈووکیٹ ہارون نے سنجیدگی سے ڈاکٹر کو دیکھا، جس نے ابھی یہ جملہ کہا تھا۔

''مطلب یہ کہ تین سے چار ماہ میں یہ نشے سے صحت یاب ہو جائے گا۔ لیکن یہ ہمیشہ نشے سے لڑتا رہے گا۔ نشے کو چھوڑنا اتنا آسان نہیں ہے، یہ کبھی بھی relapse (دوبارہ لگنا) ہو سکتا ہے۔ پر یہ اُسی صورت میں ممکن ہے اگر اسے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ اور تنہائی میں گلٹ (شرمندگی)، اسٹریس (ذہنی دباؤ) یا چڑچڑاپن عود آتے ہیں، جو اسے دوبارہ اسی کیفیت میں لے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ اِس نے بہت مختصر عرصے نشہ کیا ہے لیکن اسکے نشہ کرنے کے دوران وقفہ نہیں تھا، ایک نشہ اترتا تھا تو یہ دوسرا کر لیتا تھا۔'' ڈاکٹر نے تفصیل سے بتایا تو ایڈووکیٹ ہارون نے گہرا سانس خارج کیا۔

''ابھی وہ کیسا ہے؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''پچھلے ایک ماہ سے وہ detox اور withdrawl فیس میں تھا۔ یہ ایک ماہ اُس پر بہت کڑا گزرا ہے، اسے ساتوں دن اور چوبیس گھنٹے کی نگرانی میں رکھا گیا ہے۔ وہ بہت چیختا تھا، خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ نشے کی طلب اُسکے اندر بہت زیادہ تھی۔ لیکن اب شکر ہے کہ وہ اس خطرناک مرحلے سے باہر آ گیا ہے۔ اس مرحلے میں ہم نے اُسکا جسم بچایا تھا، جو نشے کا عادی ہو گیا تھا۔ اب اسکا دوسرا مرحلہ شروع ہو رہا ہے۔ اسے stabilizationphase کہتے ہیں۔ اس مرحلے میں ہم اسکا ذہن بچائیں گے۔ آج سے اسکی تھیراپی ہو گی، ہم نے اسکے اندر سے شرمندگی، ذہنی دباؤ اور اچانک اٹھنے والی نشے کی طلب کو ذہنی طور پر مارنا ہے۔ آج سے ہم اسکی روٹین بنانا شروع کریں گے۔''ڈاکٹر نے تفصیل سے بتایا۔

''اُسے میں گھر کب لے جا سکتا ہوں؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''تین ماہ تک تو بالکل نہیں، اس مرحلے کے بعد اسکے دو مزید مرحلے باقی ہیں۔ البتہ اِس مرحلے کے دوران تم اُسے کچھ دیر چہل قدمی کی لیے باہر لے جا سکتے ہو۔''

''بہت شکریہ آپکا۔ میں مطمئن ہوں۔''ایڈوکیٹ صاحب نے خوش اخلاقی سے کہا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اب انکا رخ اُس کمرے کی طرف تھا، جہاں رضا پچھلے ایک ماہ سے زیرِ علاج تھا۔

رضا کو ہارون صاحب نے پہلی بار تب دیکھا تھا، جب وہ غریبوں میں لنگر تقسیم کرنے آئے تھے۔ رضا کو تھیلی میں کھانا دیتے ہوئے وہ چونک اُٹھے۔ اُس وقت اُسکا حلیہ کہیں سے بھی کسی فقیر کا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور مہذب لڑکا تھا، نجانے اُسے کیا مجبوری تھی، جو ایسے سڑک پر بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا؟ انسانی ہمدردی کے تحت وہ اُسکے پاس گئے تو اُس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا، اور اسکی آنکھیں، اُسکی دنیا سے ستائی آنکھیں ہارون صاحب کو ہمیشہ یاد رہ گئیں۔ وہ وہاں سے بھاگ گیا، پر وہ بار بار اُسکے بارے میں سوچتے رہے۔ اگلے دن وہ دوبارہ وہاں آئے تا کہ اُسکے بارے میں معلوم کر سکے پر وہ انہیں نہ ملا۔ اور ایک ماہ قبل جب وہ کسی دوست سے ملنے ریسٹورانٹ کی طرف جا رہے تھے، تب وہ اچانک ہی اُن سے ٹکرا کر گر گیا۔ وہ اُسے کوئی چرسی سمجھ رہے تھے۔ پر اُسکی آنکھیں۔۔۔ اُن آنکھوں سے اسکی شناخت ظاہر ہو گئی۔ وہ اُسے اس حالت میں دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ انہیں یقین نہ آیا کہ جس لڑکے کو انہوں نے اچھے لباس میں دیکھا تھا، آج وہ انہیں

فقیروں سے بھی بد تر ملے گا۔ وہ انسانی جذبے کے تحت اُسے ہسپتال لے آئے۔ جب ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ عادی نشئی ہے، تب یہ بات انسانی جذبے سے آگے نکل گئی۔ پھر وہ اُسے علاج کے لیے rehab سینٹر لے آئے، جہاں وہ پچھلے ایک ماہ سے Detoxification کے مرحلے میں تھا۔ اور آج ڈاکٹر نے یہ خوشخبری سنائی کہ وہ اس مرحلے سے آگے بڑھ کر دوسرے مرحلے میں آچکا ہے۔

ہارون صاحب اُسکے کمرے میں آئے تو وہ خاموش بیٹھا، کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی سے چھن کر آتی صبح کی دھوپ نے اُسکا چہرہ روشن کرر کھا تھا۔ اُس نے انکے آنے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

''کیا تم کچھ دیر کے لیے باہر چلو گے؟'' ہارون صاحب نے پوچھا، اس نے یکسر نظر انداز کیا۔ پچھلے ایک ماہ سے اسکا یہی رد عمل تھا، وہ ہارون صاحب کو ایسے ہی نظر انداز کیا کرتا تھا۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو اُسکے شروع کے دس روز بہت زیادہ خطرناک تھے، وہ بار بار خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا، چیختا، چلاتا، گالیاں دیتا، آخر میں رو رو کر نشہ مانگتا۔ دس روز بعد بلاآخر detoxification کا اثر آہستہ آہستہ نظر آنے لگا۔ اُسکے چیخنے چلانے میں کمی آنے لگی۔

''ہم باہر چہل قدمی کریں گے۔ ڈاکٹر نے اسکی اجازت دے دی ہے۔ لیکن اگر۔۔۔'' ہارون صاحب نے دوبارہ کہنا چاہا۔

''میں چلوں گا۔'' اُنکی بات کاٹتے ہوئے وہ اچانک ہی بولا تو وہ کچھ لمحوں کے لیے حیران رہ گئے۔ اُس نے آج پہلی بار انہیں کسی بات کا جواب دیا تھا۔ ہارون صاحب خوش ہوئے۔ اُسے سہارا دیکر اُٹھایا اور rehab سینٹر کے باغ میں لے آئے۔ کچھ دیر وہ اُنکے ساتھ خاموشی سے چلتا رہا، وہ اُس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ یکدم ہی رضا نے ایک انوکھی فرمائش کی۔

''کیا وہ قلفی والا ہے؟'' اُس نے سینٹر کے باہر کھڑے ایک ریڑھی والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! کیا تمہیں کھانی ہے؟'' اُنہوں نے پوچھا تو اُس نے اثبات میں سر ہلایا، انہیں خوشگوار حیرت نے آگھیرا۔ پچھلے ایک ماہ سے وہ چند لقموں کے علاوہ کچھ بھی نہیں کھا پارہا تھا۔

''سنو! ریڑھی والے سے ایک قلفی خرید لاؤ۔'' ہارون صاحب نے اپنے ساتھ چلتے ملازم سے کہا۔ نجانے وہ کتنے امیر تھے؟ اپنے ساتھ دو اسلحہ بردار چوکیدار ہمہ وقت لیے پھرتے تھے۔

''میں بھی وہاں جانا چاہتا ہوں۔''اُس نے ایک اور فرمائش کی۔ پر اس بار ہارون صاحب تھوڑا ہچکچائے کہ ڈاکٹر نے اُسے ہسپتال کے احاطے سے باہر لے جانے سے منع کیا تھا۔

''کیوں؟''اُنہوں نے ٹالنے کی غرض سے پوچھا۔

''میرا دل کر رہا ہے۔''اُس نے اتنی معصومیت سے کہا کہ ہارون صاحب مان گئے، پھر اُسے سہارا دے کر ریڑھی تک لائے۔ انکا ملازم قلفی خریدنے کے لئے قطار میں کھڑا تھا۔ رضا وہیں ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا تو انہیں کچھ تسلی ہوئی۔ اُنہوں نے آس پاس نگاہ دوڑائی تو دیکھا کافی گہما گہمی تھی، لوگوں کے درمیان آنا یقیناً رضا کے لیے خوش آئند تھا۔ اُنہوں نے نظریں دوبارہ گھمائیں پر یہ کیا؟ وہ وہاں نہیں تھا۔

''ارے! وہ لڑکا کہاں گیا؟''وہ چیخ اُٹھے۔ ملازم اور چوکیدار جو کچھ دور کھڑے تھے بھاگ کر آئے۔ اُنہوں نے پریشانی سے آس پاس دیکھا اور اگلے ہی لمحے رضا انہیں سڑک پر کسی درخت کی آوٹ لیکر آگے بڑھتا نظر آیا۔ اُسکا دماغ ابھی اتنا بہترین نہیں ہوا تھا کہ وہ سوچ سکتا، کہ جس جگہ سے وہ چھپ کر جا رہا ہے، وہاں سے وہ باآسانی نظر آ جائے گا۔ ہارون صاحب نے سکون کا سانس خارج کیا۔

''جاؤ! اُسے پکڑ کر لاؤ جلدی۔۔۔''اُنہوں نے چوکیدار کو حکم دیا تو وہ دونوں کچھ ہی لمحوں میں اُسے پکڑ لائے۔ لیکن اس بار رضا نے مزاحمت کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ چیخ بھی رہا تھا، خود کو چھڑوا بھی رہا تھا، پر کچھ کر بھی نہیں پا رہا تھا کہ اُس میں اتنی طاقت نہ تھی۔ ہارون صاحب تو اُسکے ردعمل پر حیران رہ گئے۔ بڑی مشکلوں سے اُسے قابو کر کے اندر لایا گیا۔ پھر ڈاکٹروں نے اُسے اپنی انتہائی نگہداشت میں لے لیا۔

''یہ کس قسم کی لاپرواہی ہے ہارون؟''ڈاکٹر ہارون صاحب پر ہی برہم ہوا، وہ انکا پرانا دوست بھی تھا۔

''مجھے لگا اب وہ بہتر ہے۔''وہ پشیمان ہوئے۔

''کیسے بہتر ہے؟ جبکہ میں نے کہا بھی ہے کہ ابھی کم از کم اُسے تین ماہ مزید درکار ہیں۔ وہ صرف پہلے مرحلے سے کامیابی سے نکلا ہے، لیکن اگر ذرا لاپرواہی کی گئی تو دوبارہ اُسی پوزیشن میں پہنچ جائے گا۔''ڈاکٹر سخت ناراض تھا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔دوبارہ ایسا نہیں ہوگا۔''اُنہوں نے شرمندگی سے کہتے شیشے کی دیوار کے پار نظر آتے رضا کو دیکھا جو اب دواؤں کے زیرِاثر پر سکون تھا۔

----------+---------+--------

''میں تمہارا نام نہیں جانتا، کیونکہ تم نے مجھے اب تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''اگلے روز وہ کچھ بہتر ہوا تو ہارون صاحب اُس سے ملنے آئے۔اُنکے ہاتھوں میں کوئی شے تھی۔ رضا خاموش بیٹھا رہا۔

''میں بس یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو؟پڑھے لکھے لگتے ہو،اچھے مہذب بھی ہو، پھر کیوں خود کو اس نہج پر لے آئے؟کیا ایسی زندگی تمہارا خواب تھی؟''اُنہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''مجھے کسی کا احسان نہیں چاہیے۔''جواب بڑا ہی غیر متوقع تھا۔

''کیوں؟کیوں نہیں چاہیے؟''اُنہوں نے پوچھا، کیا معلوم اسی بہانے وہ کچھ بولے۔

''احسان کرنے والے جتاتے ہیں، ناخدا بن جاتے ہیں۔ذلیل کرتے ہیں۔ذلت کی روٹی دیتے ہیں اور خود کو بہترین سمجھتے ہیں۔''اُسکی باتیں اتنی سوجھ بوجھ والی تھیں کہ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ ایک ماہ پہلے وہ ہارون صاحب کو ایک عادی نشئی کے طور پر ملا تھا۔یہاں تک کہ اسکے لباس سے پیشاب کی بو تک آرہی تھی۔

''میں احسان نہیں کر رہا تم پر، بلکہ تم احسان کروگے مجھ پر۔اور میں تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر یہ احسان کر دو۔''اُنکے لہجے میں کچھ تھا، رضا نے کچھ حیران نظروں سے اُنہیں دیکھا۔

''یہ دیکھو!۔۔۔''انہوں نے ہاتھوں میں پکڑا فریم رضا کی جانب بڑھایا،اُس نے کوئی توجہ نہ دی تو انہوں نے اُسے اُسکی گود میں رکھ دیا۔ رضا نے ایک نظر فریم کو دیکھا، وہاں کوئی چوبیس پچیس سالہ خوبصورت سا نوجوان کھڑا مسکرا رہا تھا۔اُس نے سوالیہ نظروں سے اُنہیں دیکھا۔

''یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔اور یہ اُسکی آخری تصویر ہے۔''انہوں نے کہا تو وہ اب بھی خاموش رہا۔

''بہترین تعلیمی قابلیت اور ایک روشن مستقبل تھا اسکے آگے۔ سب کچھ کر سکتا تھا، سب کچھ پا سکتا تھا لیکن جانتے ہو اِس نے کیا کیا؟'' وہ رکے، اب کہ رضا منتظر سماعتوں سے اُنہیں سننے لگا۔

''اِس نے صبر نہیں کیا۔ اِس نے اپنے رب پر بھروسہ نہیں کیا۔ اسے لگا کہ ساری دنیا، ساری کائنات کا نظام چلانے والا اسلحہ مالک، اِسکے حال سے بے خبر ہے اور وہ اُسے ایسے ہی چھوڑ دے گا۔'' اُنکے الفاظ پل بھر کو رضا کو ساکت کر گئے۔

''یہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ چھوٹا تھا تو پیارا بھی بہت تھا مجھے، اس نے ایک جگہ پیسہ لگایا اور وہ کاروبار نقصان میں چلا گیا، اس نے دوسری جگہ پیسہ لگایا وہاں بھی یہی ہوا۔ میرے ابّو اسے اٹھتے بیٹھتے پیسے برباد کرنے پر رسوا کرتے، دوست یار بھی اُسے چھوڑ گئے تھے۔ یہ قرضوں میں ڈوب گیا۔ اُس وقت میں بیرونِ ملک، بیرسٹری پڑھنے گیا ہوا تھا۔ کاش! میں یہاں ہوتا۔'' انکا لہجہ بھیگا تھا۔

''اُس نے ایک روز ناراض ہو کر گھر چھوڑ دیا۔ پھر کبھی نہ لوٹا۔ ابّا کو لگا کہ کہیں پیسے ہی اُڑا رہا ہوگا، جب ختم ہو جائیں گے تو واپس آ جائے گا، انہوں نے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی۔ جب میں وطن واپس آیا تو مجھے اس واقعے کی خبر ملی، میں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔ چھ ماہ کی ان تھک محنت کے بعد وہ مجھے اس حال میں ملا کہ نشہ کرنے کی وجہ سے اُسکی یاداشت تک جاچکی تھی۔ میں اُسے لیے یہیں آیا، لیکن اُسکی حالت کافی خراب تھی۔ مجھے لگا تھا کہ میں اسکا علاج کروالوں گا لیکن۔۔۔ اُس نے انتہائی نگہداشت کے باوجود بھی یہیں، اسی سینٹر میں خودکشی کرلی۔ میں اُسے بچانا چاہتا تھا پر اُس پر مایوسی اس حد تک سوار تھی کہ اُس نے حرام موت کو قبول کر لیا۔ اب میں سوائے روز اللہ سے اُسکی مغفرت مانگنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ روز سوچتا ہوں کہ کاش میں پہلے آجاتا تو کچھ کر پاتا۔'' وہ رکے، رضا دم بخود سا انہیں سن رہا تھا۔

''تمہیں دیکھا تو اپنا بھائی یاد آیا، سوچا تمہیں بچالوں تو شاید دل کا بوجھ کچھ کم ہو جائے۔ تم اگر اپنا علاج کروالو، تو یقین مانو کہ تم میری ذات پر احسان کرو گے، اس آدمی کو شرمندگی سے باہر نکال لو گے اور یہ احسان تمہارا میں کبھی نہیں بھولوں گا۔'' اُس نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔

''میں چلتا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے، وہ اب بھی کچھ نہ بولا تو وہ مایوسی سے جانے کے لیے مڑ گئے۔

''رضا نام ہے میرا۔۔۔ رضائے الٰہی۔۔۔'' اُس کی آواز پر اُنہوں نے پلٹ کر دیکھا، اب وہ خاموشی سے اپنے برابر میں رکھا کھانا اٹھا کر کھا رہا تھا۔ آج اُسکا انداز کچھ پر سکون سا تھا۔

''بہت پیارا نام ہے۔'' وہ اتنا ہی کہہ سکے۔

----------+---------+--------

رضا کا دوسرا مرحلہ بھی باخیر وخوبی مکمل ہو گیا، وہ اب بنا سہارے کے چلنے لگا تھا، ہلکی پھلکی بات کر لیا کرتا تھا۔ کتابیں پڑھنے لگا تھا، کچھ دیر ٹی وی دیکھ لیتا۔ اب اصل طور پر اُسکی rehabiliation کا وقت تھا۔ تیسرے مرحلے میں اسکی انفرادی تو کبھی گروپ کی شکل میں تھیراپی ہوتی۔

انفرادی تھیراپی میں اُس نے بولنے میں بہت وقت لیا، کافی وقت وہ تھیراپسٹ کے سامنے منہ بند کیے، دیواریں تکنے میں گزار دیتا۔ آہستہ آہستہ اُسے سب یاد آنے لگا تھا، اُسکی مایوسی اب غصّے میں بدلنے لگی تھی۔ نشہ کرنے پر ندامت اندر ہی اندر سر اٹھانے لگی۔

''میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں؟''

''میں نے یہ کیا کر دیا؟''

ایسے سوالات اب ہر وقت ستاتے رہتے، یہ تیسرا مرحلہ جسے therapeutic phase کہتے ہیں، یہ دراصل اپنے آپ سے جنگ لڑنے کا مرحلہ تھا، یہ خود کو پہچاننے اور خود کو سمجھنے کا مرحلہ تھا۔ ایک روز بلآخر اُس نے اپنا سارا دکھ، سارا ماضی تھیراپسٹ کے سامنے کہہ سنایا۔ اُس روز ہارون صاحب دوسرے کمرے میں بیٹھے سب سن رہے تھے، اُسکی کہانی سن کر بے شک انکا بھی دل دکھا لیکن کہیں نہ کہیں اِس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ وہ اب آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہا تھا۔ جب اُس نے سب کہہ سنایا تو اپنا آپ کچھ کچھ بہتر لگنے لگا۔ لیکن ساتھ خود پر غصّہ آنے لگا، کہ آخر اُس نے یہ اپنے ساتھ کیا ہی کیوں؟ وہ کیوں اتنا مایوس ہو گیا؟ اتنی اذیت سہہ کر اسکی ماں نے کبھی مایوسی اختیار نہیں کی، تو وہ اُس ماں کا بیٹا ہو کر ایسا کیسے کر سکتا تھا؟ اِس سے پہلے کہ وہ احساسِ ندامت کی وجہ سے دوبارہ ڈپریشن میں جاتا، اُسکی گروپ تھیراپی شروع ہو گئی۔

وہ تو فطرتاً بھی سب سے الگ تھلگ رہنے والا انسان تھا، گروپ تھراپی میں وہ بالکل خاموش رہتا، ایک لفظ نہ بولتا۔ ڈاکٹر بھی اُسے کچھ نہ کہتے، اُسکی خاموشی کو ہی اسکی طرف سے participation (حصّہ ڈالنا) سمجھا جاتا۔ وہ کوئی ردِ عمل نہ دیتا پر سنتا سب تھا۔ اُنکی کہانیوں نے اُسے احساس دلایا کہ وہ اِس جنگ میں اکیلا نہیں ہے۔ اُن سب لوگوں کی داستان سن کر اپنے اوپر آیا غصّہ جانے لگا، خود کو قصوروار

ٹھہرانے کی بجائے، خود کو بدلنے کی امید جاگنے لگی۔ وہ پہلے سے کہیں بہتر ہو گیا۔ آخر میں ڈاکٹروں نے اُسے relapse سے بچنے کے تمام طریقے سکھائے۔ لیکن ایک شے، جس نے ہارون صاحب کو پریشان کیا، وہ تھا رضا کا سگریٹ پینا۔

گروپ تھراپی کے دوران کسی مریض سے رضا نے سگریٹ لے لی تھی اور اب وہ کبھی کبھار پیتے ہوئے نظر آنے لگا تھا۔ اُس سے بھی زیادہ اور شدید حیرت اس بات کی تھی کہ ڈاکٹر اِس چیز کو نظرانداز کر رہے تھے یا جان کر کچھ نہیں کہہ رہے تھے؟ rehab سینٹر میں اکثر مریض سگریٹ پیتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ہارون صاحب پریشان تو تھے پر خاموش رہے۔

جب اُسکا تیسرا مرحلہ مکمل ہوا تو ڈاکٹر نے اُنہیں بلوایا۔

''اب رضا گھر جا سکتا ہے۔'' ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی۔

''پر آپ نے تو چوتھے مرحلے کا کہا تھا۔'' وہ حیران ہوئے۔

''یہی چوتھا مرحلہ ہے۔ اور یہ مرحلہ ساری زندگی رہے گا۔ اسے aftercare کہتے ہیں۔ اس مرحلے میں رضا اپنی عملی زندگی شروع کریگا لیکن فالو اپ (وقتاً فوقتاً جانچ) کے لیے آتے رہنا ہو گا۔ ایک آدھ دوائیں بھی چلیں گی۔ اُسکے علاوہ اسے کرونیک مائیگرین کا مسئلہ بھی ہے۔ جب کبھی اسکی حالات بہت زیادہ بگڑے اور ایسا لگنے لگے کہ اُسکے ہاتھ پیر سن ہو رہے ہیں تو فوراً ہسپتال لائیں، اگر ہسپتال لانا ممکن نہ ہو تو ایک دوا میں نے رضا کو دی ہے، جو اُسے ساری زندگی اپنے پاس رکھنی ہے، لیکن کسی ناگزیر صورتحال کے علاوہ اُسے استعمال نہیں کرنا۔'' وہ تمام تفصیل بتاتے رہے اور ہارون صاحب سنتے رہے۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن رضا۔۔۔'' وہ ذرا رکے، ''وہ سگریٹ پینے لگا ہے۔'' اُنہوں نے پریشانی سے کہا۔

''ہاں! میں جانتا ہوں، اکثر مریض پیتے ہیں۔'' اُنہوں نے سکون سے کہا۔

''تو آپ منع نہیں کرتے؟'' وہ حیران ہوئے۔

''یہ بھی علاج کا طریقہ ہے، کچھ مریضوں کے لیے ہمیں یہ کرنا پڑتا ہے۔ اسے ہم ہارم ریڈکشن اپروچ (نقصان کم کرنے کی حکمتِ عملی) کہتے ہیں۔ یہ دماغ کو فعال رکھنے کے لئے ہے۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ سگریٹ اچھی شے ہے، مگر فلحال، نشے کی طرف واپس پلٹنے سے

بہتر سیگریٹ ہے۔ ہم ہر شے کو ایک ساتھ ختم نہیں کر سکتے، کچھ باتوں پر فلوقت سمجھوتہ کرنا پڑے گا، اگر وہ کم نقصان دہ ہوں۔ ڈرگز اور الکوحول سیگریٹ سے سو گنا زیادہ نقصان دہ ہے۔ اور ہمیں یقین ہے جو نشہ چھوڑ سکتا ہے وہ سیگریٹ بھی چھوڑ ہی دے گا۔ اگر سیگریٹ اُسے واپس وہاں جانے سے روکے رکھتا ہے تو فی الحال یہی بہتر انتخاب ہے، لیکن تم ابھی اُسکے ساتھ کوئی زبردستی نہ کرنا۔" ہارون صاحب کو بات سمجھ آگئی۔ وہ پرسکون ہوتے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رضا آخری بار تمام ڈاکٹروں، اپنے ساتھی مریضوں سے اچھے سے مل کر ہارون صاحب کے ساتھ آگیا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کریگا؟ ابھی اُس نے اپنا مستقبل نہیں سوچا تھا لیکن اُسکو ایک بات معلوم تھی کہ اب وہ دوبارہ کبھی مایوس نہیں ہوگا۔ کیونکہ قسمت بار بار مہربان نہیں ہوتی۔ یہ بھی شاید اُسکی مرحوم ماں کی دعائیں تھی جو وہ اُس کڑے وقت سے نکل آیا ورنہ تو وہ اپنی زندگی برباد کر ہی چکا تھا۔

ہارون صاحب پہلے اسے ایک اچھے سے مردانہ سیلون میں لے آئے۔ اُسکے نہ نہ کرنے کے باوجود بھی انہوں نے اسکو سیلون والے کے حوالے کر دیا، اُس نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لگا کر رضا کا مرجھایا چہرہ نکھار دیا۔ پھر وہ اُسے لیے ایک اچھے سے ریسٹورانٹ آئے، وہاں اُسکے ساتھ کھانا کھایا اور پھر اُسے اپنے گھر لے آئے۔

----------+---------+--------

وہ اُنکے گھر تو آگیا تھا لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ بے چین سا ہے، یقیناً اُنکا احسان نہیں لینا چاہتا تھا۔ اُسے آئے چوتھا روز تھا، جب اُنہوں نے ایسے ہی اُس سے اُسکی تعلیم کے بارے میں پوچھ لیا۔

"ایم بی اے کیا ہے۔" اُس نے مختصر جواب دیا۔

"مجھے اپنے پاس منیجر کی ضرورت ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو۔۔۔"

"میں مزید آپکا احسان نہیں لینا چاہتا۔ مجھے خود سے کچھ کرنا ہے۔ لیکن۔۔۔" وہ رکا۔

"لیکن؟"

''میرے پاس میرے کسی قسم کے کوئی ڈاکومنٹس (کاغذات) یاڈگری وغیرہ نہیں ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ کیسے لوں؟''اُس نے پریشانی سے کہا۔

''اُسکی فکر نہ کرو، وہ میں کر دیتا ہوں۔ ابھی مجھے یہ بتاؤ، جن لوگوں نے تمہارے ساتھ یہ سب کیا، کیا تم اُن سے بدلا نہیں لوگے؟ کیا انہیں ایسے ہی چھوڑ دوگے؟''انکا سوال بڑا ہی غیر متوقع تھا۔

''کیا مطلب؟''اُس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''اُس روز جب تم تھراپسٹ کو سب بتا رہے تھے تب میں بھی وہیں تھا، مگر دروازے کے پیچھے۔۔۔ خیر! یہ تو ثانوی باتیں ہیں۔ مجھے بتاؤ کیا تم اُن سے انتقام لینا نہیں چاہتے؟''

''کیسے؟ کیسے لے سکتا ہوں میں انتقام؟ میرے پاس تو خود کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔''اُس نے تلخی سے کہا۔

''تمہارے باپ کی جائیداد میں تمہارا حق ہے، میں ایک وکیل ہوں، بہت آسانی سے تمہارے باپ کو تمہیں اٹھارہ سال تک خرچہ اور مالی تعاون فراہم نہ کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔''اُنہوں نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اس وقت لان میں بیٹھے تھے، موسم خوشگوار تھا۔

''مجھے اُنکے پیسوں میں سے ایک روپیہ بھی نہیں چاہیے۔''اُس نے حتمی انداز میں کہا، تو ہارون صاحب خاموش ہوئے۔ پھر یکدم ہی رضا سیدھا ہوا۔

''کیا آپ جائیداد کے تنازعے پر کیس لڑتے ہیں؟''اُس نے اچانک ہی پوچھا۔

''ہاں! میں فیملی لائر ہوں، یہ میرا کام ہے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ اگر باپ کی جائیداد کے لیے پوچھ رہے ہو تو وہ ابھی زندہ ہیں اور۔۔۔''

''میں انکی بات نہیں کر رہا۔''رضا نے انکی بات کاٹی۔

''پھر؟''اُنہوں نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے بغور اُسے دیکھا۔

''میرا ننھیال وددھیال، دونوں ہی مالی طور پر بہت مستحکم تھے۔ بلکہ نانانانی تو کافی رئیس تھے۔ اپنی کئی زمینیں اور مکان وغیرہ تھے اُنکے، مجھے اچھے سے یاد ہے کہ دادی بتاتی تھیں کہ نانانانی نے اپنے ترکے میں کئی زمینیں چھوڑی تھیں، جن میں سے امی کے حصے میں دو تھیں، یا شاید تین۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں! دادی اکثر امی کو کہتیں کہ وہ زمینیں واپس لے لیں، کیونکہ وہ ماموں نے قبضہ کرر کھی تھیں۔ پر امی کہتیں کہ کوئی فائدہ نہیں، وہ زمینوں کے لیے کیس کر بھی لیں، اور وہ مل بھی گئیں، تو اُس پر میرے ابّو قبضہ کر لیں گے۔ اُسکے علاوہ ایک گھر جس میں میری زندگی گزری، اور جس میں اب ماموں لوگ رہتے ہیں وہ بھی دادی نے امی کے نام کیا تھا۔ پر اُس پر بھی ماموں کا قبضہ ہے۔''اُس نے یاد کر کے بتایا۔

''بہترین! تمہاری ماں کے مرنے کے بعد یہ سب تمہارا ہے رضا! تمہارے ماموں کا اس پر کوئی حق نہیں۔''انہوں نے کہا۔

''پر میں کیسے وہ سب واپس لوں؟ اگر مجھے میرا حصّہ مل جائے تو مجھے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑے گا، اور نہ ہی کسی کا احسان لینا پڑے گا۔ کیا آپ میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟''اُس نے پوچھا، اتنے عرصے میں پہلی بار وہ پُراُمید اور پُرجوش نظر آیا تھا۔ ہارون صاحب خوش ہوئے۔

''ہاں! مجھے ایک ہفتے کا وقت دو، میرا ایک دوست تمہارے تمام ڈاکومنٹس کی کاپی نکال لے گا۔ بس اسکے لیے کل تمہیں نادرا چلنا ہوگا، تمہارے انگوٹھے کے نشان کے ذریعے ہم تمہارے تمام کاغذات نکلوا لیں گے۔ پھر میں عدالت میں تمہارے ماموں پر دعویٰ کروں گا۔'' اُنہوں نے اپنا لائحہ عمل ترتیب دیا۔

''مجھے میرا حق مل جائیگا نا؟''اُس نے پوچھا، ہارون صاحب اُسکی آنکھوں میں جلتے اُمید کے دیے بجھانا نہیں چاہتے تھے۔

'' بالکل مل جائے گا، میرا وعدہ ہے تم سے رضا! میں واپس لاؤں گا۔''انہوں نے اُسکے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو پہلی بار وہ مسکرایا، احسان مندی سے۔ کچھ لوگ بہت ہی عجیب دل لیکر پیدا ہوتے ہیں، بے لوث، بے غرض اور مخلص۔ وہ اللہ کی مخلوق سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ اُن پر فرشتے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ہارون صاحب بھی انہی میں سے تھے۔ اور حسین؟ رضا کو یکدم ہی اپنا دوست یاد آیا۔ اور اسکے اِس طرح اچانک یاد آنے پر وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ اُس نے سوچوں و یادوں کو جھٹکنے کیلئے سگریٹ نکال کر جلائی۔

''تم یہ پینا نہیں چھوڑو گے؟''اُسے سگریٹ جلاتا دیکھ کر ہارون صاحب نے پوچھا۔

”Once an addict, always a recovering addict“

اُس نے ڈاکٹر صاحب کے الفاظ یاد دلائے تو وہ ہنس دیئے۔

----------+---------+--------

ہارون صاحب واقعی اپنے پیشے کے بہت ماہر تھے، جب اُنہوں نے رضا کے ماموں کو عدالت کی طرف سے نوٹس بھجوایا تو پہلے تو انہیں یقین ہی نہ آیا۔ بھلا آٹھ نو ماہ سے لاپتہ رضا اچانک سے واپس کیسے آگیا؟ اور اُس پر سے اُسکے پاس اتنے پیسے کہاں سے آگئے کہ وہ اُن پر دعویٰ کرے؟ پہلی سماعت پر تو انہوں نے عدالت آنے کی زحمت ہی نہ کی۔ دوسری سماعت پر اُنکی گرفتاری کے وارنٹ نکل آئے۔ تب جا کر انہیں احساس ہوا کہ معاملہ پیچیدہ ہے۔ وہ اپنی ضمانت کروانے کے بعد ایک اچھا وکیل کر کے عدالت حاضر ہوئے۔

کئی ماہ تک عدالتوں کا چکر لگتا رہا۔ ہارون صاحب بڑے منجھے ہوئے وکیل تھے، نجانے کہاں کہاں سے اُنکا پورا شجرہ نسب نکال لائے تھے؟

رضا کو تو ٹھیک سے معلوم نہ تھا، لیکن حکومتی ریکارڈ کے ذریعے تمام باتیں سامنے آگئیں۔ اُسکے نانانانی کی چھوڑی گئی جائیداد میں سے تین زمینیں رضا کی ماں کی تھیں، جو یقیناً اب رضا کی ہونی چاہیے تھیں، اسی طرح وہ بنگلہ جس میں وہ رہتے تھے، وہ بھی اُسکی ماں کے نام تھا۔ ہر سماعت پر رضا کے ماموں بری طرح ناکام ہوتے اور بلآخر وہ یہ کیس ہار گئے۔ عدالت نے فوری تمام زمینیں رضا کے حوالے کرنے کا حکم دیا تھا۔ بنگلے پر انہیں ایک سال کا اسٹے مل گیا تھا۔

”اُن میں سے ایک زمین پر میرا کاروبار چلتا ہے۔ میں وہ کیسے واپس کروں؟“ اُنہوں نے چہرے پر مظلومیت طاری کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو قبضہ کرنے سے پہلے سوچنا تھا۔“ قاضی کا تبصرہ دوٹوک تھا۔

”پر وہ تو میری بہن نے خود مجھے دی تھیں کہ وہ یہ سب نہیں سنبھال سکتی تھی۔“ اُنہوں نے خجل ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ اس ایک بات کو ثابت کرنے کے لیے پورا مقدمہ لڑ چکے ہیں لیکن پھر بھی ثابت نہ کر سکے، اُسکے بعد بھی پھر وہی جھوٹ؟“ قاضی صاحب کو غصّہ آگیا تھا۔

”مم۔۔۔ میں اُس زمین کی قیمت ادا کر دوں گا۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟“ وہ سچ مچ پریشان ہوئے تھے۔

''وہ آپ دونوں فریقین کا آپسی مسئلہ ہے، اگر بیٹھ کر، بات چیت کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے تو عدالت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔''

مقدمے کی سماعت ختم ہوگئی۔

کمرہ عدالت کے باہر یہ معاملہ حل کرلیا گیا کہ وہ رضا کو تین میں سے دو زمینیں واپس کردیں گے، جبکہ تیسری زمین، جس پر انکا کاروبار کھڑا تھا، اُسکی قیمت ادا کردیں گے۔ اُنکی پوری کوشش تھی کہ زمین کی کم سے کم قیمت ادا کریں۔ لیکن ہارون صاحب کے آگے اُنکی ایک چالا کی کام نہ آئی۔

''بنگلے پر ملنے والا اسٹے کافی لمبا ہے، مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اُس کی بھی قیمت لے لینی چاہیے تھی۔ یہ آدمی بعد میں بھی اُسے نہیں چھوڑے گا۔'' جب تمام معاملات حل ہوگئے، رضا کو زمین کی قیمت، ایک خالی پلاٹ اور ایک پوش علاقے میں بنا بنگلہ جسے اُسکے ماموں نے کرائے پر دیا ہوا تھا، مل گیا۔ تب ہارون صاحب نے ایک روز اُس سے پوچھا۔

''بنگلے کا معاملہ میں بعد میں دیکھوں گا۔ کچھ چیزوں کو وقت پر چھوڑ دینا چاہیے، ابھی آپ مجھے بتائیں کہ میں کیا کرسکتا ہوں؟'' اُس نے پیسوں اور زمینوں کے متعلق اُن سے مشورہ لینا چاہا۔

''بنگلہ کرائے پر رہنے دو، اُسکا کرایہ ٹھیک ٹھاک آتا ہے۔ تمہارا ماہانہ گزر بسر اچھے سے ہوگا۔ پلاٹ کے بارے میں میری رائے تو یہ ہے کہ تم کوئی کاروبار شروع کرلو۔'' آج کل، ہارون صاحب کی بدولت اُسے کچھ ٹیوشن مل گئے تھے۔ وہ چھوٹے بچوں کو پڑھانے لگا تھا۔

''میں اُس بنگلے کو فلحال خالی نہیں کروا رہا۔ لیکن کچھ عرصے بعد میں خود وہیں منتقل ہوں گا۔ پلاٹ کے بارے میں میری خواہش ہے کہ میں وہاں اسکول بنوالوں۔ ماموں نے زمین کی جو قیمت ادا کی ہے، اُس سے اسکول کی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے نا؟'' اُس نے جاننا چاہا۔

''بالکل! اسکول کی تعمیر اُن پیسوں سے باآسانی کی جاسکتی ہے، بلکہ رقم اچھی خاصی ہے، تم اسکول کا فرنیچر اور دیگر کام بھی باآسانی کرسکتے ہو۔'' اُنہیں رضا کی بات پسند آئی۔ اگلے دن سے رضا نے اسکول کی تعمیر کے لیے بھاگ دوڑ شروع کردی۔ اُسے مسلسل محنت میں جتا دیکھ ہارون صاحب کو تسلی ہوتی، وہ وقتاً فوقتاً اُسکی رپورٹ ڈاکٹر کو دیتے رہتے۔ اُسکی اس خوش آئند تبدیلی کو ڈاکٹر بہترین قرار دے رہے تھے۔

سال بھر بعد اُسکا اسکول نہ صرف مکمل تعمیر ہوگیا، بلکہ رضا نے اُس میں اچھا خاصا فرنیچر، بہترین انٹیریئر اور اسکول کی ٹھیک ٹھاک مارکیٹنگ بھی کروائی تھی۔ یہ تمام کام وہ بنگلے سے آنے والے کرائے سے کرتا تھا۔ اپنا گزر بسر وہ ٹیوشن کے پیسوں سے کرلیتا، ہارون

صاحب سے ایک روپیہ نہ لیتا۔ وہ بھی اسکی خودداری کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے تھے، لہٰذا اُسے کچھ نہ کہتے۔ سال بھر بعد جب اسکول فعال کرنے کا وقت آیا تو، اُسکے کرائے دار اپنے آپ ہی گھر خالی کر کے چلے گئے۔ اُنکے جانے کے بعد رضا اسی گھر میں منتقل ہو گیا۔ بنگلہ پرانا تھا، کافی جگہ سے خستہ حال بھی تھا۔ رنگ وروغن کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن فلحال اُسے ان سب چیزوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اسے صرف اسکول کے فعال ہونے کا انتظار تھا۔ لیکن اسکی اُمید کے برعکس، کوئی داخلہ نہ آیا۔ اُس پر سے اُس نے اساتذہ کرام کے لیے بھی آسامیاں بھرتی کرنی شروع کر دی تھی، ابھی اسکول صرف پرائمری تک تھا لیکن پھر بھی اسٹاف کی ضرورت تو تھی۔ کرائے داروں کے جانے کے بعد اُسے یہ پریشانی ہونے لگی کہ اگر بچے نہ آئے تو وہ اسٹاف کو کیسے تنخواہ دے گا؟ ابھی بھرتیاں شروع نہیں ہوئی تھیں، لیکن دو ماہ بعد سے اُسے باقاعدہ پڑھائی شروع کروانی تھی۔ لیکن داخلے نہ ہونے کے برابر تھے۔ اگر کوئی آتا بھی تو بس اسکول کے متعلق معلومات لیکر چلا جاتا۔ اِس صورتحال نے اُسے ٹھیک ٹھاک پریشان کر دیا تھا۔ ہارون صاحب کو الگ فکر لاحق تھی کہ اگر اسکول نہیں چلا تو کہیں وہ دوبارہ مایوسی کا شکار نہ ہو جائے۔

''تم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کر لی۔ اب سب اللہ پر چھوڑ دو۔'' وہ اُسے تسلی دیتے تو وہ کچھ نہ کہتا۔

کیا کہتا؟ اللہ کے سامنے جانے سے تو وہ ڈرنے لگا تھا۔ اپنی حرکت کے بعد سے دعا مانگتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اسی طرح پریشان سا ایک روز وہ باہر نکلا، ارادہ سگریٹ خرید کر پینے کا تھا۔ خاموش سنسان سڑک پر وہ پیدل چل رہا تھا، جب اسے کسی بچے کی رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ ٹھٹک کر رکا۔ اِس سنسان سڑک پر بھلا کوئی بچہ کیوں موجود ہو گا؟ لیکن رونے کی آواز مستقل آتی رہی۔ وہ آواز کی سمت کا تعین کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا، اور تب ہی اسکی نگاہ ایک درخت کے نیچے کھڑی اُس بچی پر پڑی، جو گلابی رنگ کا کاٹن کا فراک پہنے کھڑی، درخت کو خوف زدہ انداز میں تھامے رو رہی تھی۔ رضا ششدر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ تیزی سے بچی کے پاس آیا۔

''کون ہو بیٹا آپ؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اُس نے بچی کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی تو وہ ڈر کر پیچھے ہوئی۔

''اوکے اوکے۔۔۔ ڈرو نہیں!'' رضا نے فوراً اپنے ہاتھ پیچھے کیے۔

''مجھے بتاؤ! آپ کون ہو؟ اور کیا کر رہی ہو یہاں؟ امی ابّو کہاں ہیں؟'' اُس نے آرام آرام سے پوچھا۔ بچی عمر میں تقریباً پانچ چھے سال کی لگتی تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا، بس روتی رہی۔

''بھوک لگی ہے؟کچھ کھاؤ گی؟'' رضا نے مزید پوچھا تو اسکے رونے میں کمی آئی، آنسو بھری معصوم آنکھوں سے اُسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا! یہ دیکھو! میرے پاس سینڈوچ ہے۔ تم کھاؤ گی؟'' وہ سگریٹ لینے گیا تھا لیکن پاس بیکری سے ایک سینڈوچ بھی خرید لیا تھا۔ وہی اُسکی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے پہلے رضا کو دیکھا، پھر سینڈوچ کو۔ پھر درخت کو چھوڑ کر ہاتھ آگے بڑھایا اور سینڈوچ لے لیا۔ رضا نے سکھ کا سانس لیا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' جب بچی کا خوف کچھ کم لگنے لگا تو اُس نے پوچھا۔

''شیزا!'' اُس نے جواب دیا۔

''شیزا! امی ابّو کہاں ہے آپکے؟'' اُس نے پیار سے پوچھا۔ وہ بڑی رغبت سے سینڈوچ کھا رہی تھی۔ پتہ نہیں کتنے وقت کی بھوکی تھی؟

''امی ابّو۔۔۔۔ نہیں ہیں۔'' اس نے منہ میں بڑا سا نوالہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''نہیں ہیں مطلب؟ کہاں ہیں؟'' وہ سمجھا نہیں۔

''مر گئے، اللہ تعالیٰ کے پاس چلے گئے۔'' اُس نے بتایا تو وہ ساکت رہ گیا۔

''تت۔۔۔تو۔۔۔تو تم یہاں کیسے آئی بیٹا؟'' اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''چاچو نے مجھے مارا، اور پھر یہاں چھوڑ گئے۔'' بولتے بولتے اُسکی آنکھوں میں پھر سے آنسو نمودار ہونے لگے، رضا کا دل کٹا۔ بہت دیر وہ چپ چاپ شیزا کو دیکھتا رہا جو سینڈوچ ختم کر کے اب گم صم سی بیٹھی تھی۔ پھر گہری سانس لیتا کھڑا ہوا۔

''آپ جا رہے ہیں؟'' رضا کو کھڑا ہوتا دیکھ وہ پھر سے خوفزدہ ہوئی۔

''نہیں! ابھی نہیں جا رہا، تمہارے چاچا آ جائیں تو پھر تمہیں انکو دے کر چلا جاؤں گا۔'' اُس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ وہ مجھے مارتے ہیں۔'' وہ پھر سے رونے لگی تو اُس نے دکھ سے بچی کو دیکھا۔ بھلا اُسکا چچا اگر اسے لینے آنے والا ہوتا تو یہاں چھوڑ کر جاتا ہی کیوں؟ اُسے سمجھ نہیں آیا کیا کرے؟ شیزا کو یہاں چھوڑ کر جانے پر بھی دل راضی نہیں ہو رہا تھا۔ بلآخر اُس نے شیزا کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ اُسے لیے اپنے گھر آ گیا۔ گھر میں کھانے پینے کی کوئی شے موجود ہی نہ تھی۔ وہ اکیلا آدمی تھا، کبھی سینڈوچ تو کبھی ڈبل روٹی پر ہی گزارا کر لیتا، کبھی کبھار باہر سے دو روٹیاں لے آتا اور بس۔ راشن نام کی کوئی شے تو گھر میں تھی ہی نہ۔ بچی بیچاری تھکی ہوئی تھی، سونے کی جگہ میسر آئی تو صوفے پر ہی سو گئی۔ رضا اسے لے تو آیا تھا، پر اب اُسکے کھانے پینے اور رہنے کے متعلق فکر مند تھا۔

پاس رکھی کرسی سے سر ٹکائے، وہ پیسوں کے بارے میں سوچنے لگا، اُسکے پاس ابھی اتنی رقم موجود تھی کہ وہ اس بچی کے لیے کچھ سامان اور دس پندرہ دن کا راشن خرید سکتا تھا۔ ٹیوشن کی فیس آنے میں ابھی ایک مہینہ پورا تھا۔ جب تک گھر کرائے پر تھا، اسے پیسوں کی پریشانی نہ تھی، لیکن اب ہونے لگی تھی۔ ہارون صاحب اُس سے اکثر ملنے آتے تھے، وہ سب ٹھیک ہے کی رپورٹ انہیں دیتا، کبھی اپنے حالات نہ بتاتا کہ مزید انکا احسان نہیں چاہتا تھا۔

اگلے دن وہ صبح سویرے شیزا کو ساتھ لیے بازار گیا، اُسکے لیے کچھ ضروری سامان، جیسے کہ ٹوتھ برش، کچھ کپڑے، پونیاں اور کنگھی وغیرہ لیں۔ پھر گھر کے کھانے پینے کا سامان لیکر جب وہ واپس آیا تو دن کے بارہ بج چکے تھے۔ اُس نے پہلی بار خود سے کھانا پکایا پھر شیزا کے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ بہت دن بعد اُسے لگا کہ دنیا میں وہ تنہا نہیں ہے۔ خیر! اُس روز بھی وہ اسکول کے بارے میں سوچتا رہا۔ پر کچھ حاصل نہ ہوا۔

اگلے روز وہ اسکول آیا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا، انتظار گاہ میں والدین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ وہ سب داخلے کے لیے وہاں موجود تھے۔

اگلے پندرہ روز تک ناقابلِ یقین حد تک داخلے ہوئے تھے۔ وہ جو مشکل سے پچاس بچوں کا داخلہ ہی سوچے بیٹھا تھا، اب اُسکے اسکول میں ساڑھے تین سو بچے انرول ہو چکے تھے۔ ہارون صاحب کے نزدیک یہ معجزہ تھا، جبکہ اسکے نزدیک یہ شیزا کی قسمت تھی۔ وہ اپنے نصیب کا رزق ساتھ لائی تھی۔

اسکول سے آنے والے پیسوں کو اُس نے محفوظ کرنا شروع کر دیا۔

''تم جو پیسے جمع کر رہے ہو، میرے خیال سے تم اُس سے نئی برانچ کھول لو۔'' ہارون صاحب نے اُسے ایک دن مشورہ دیا تھا۔

''ابھی نئی برانچ کے لیے پوری ٹیم ہائر کرنی پڑے گی۔ اتنے پیسے نہیں ہو سکے گے۔'' اس نے کہا۔

''دیکھو! اچھے خاصے والدین اپنے بچوں کا داخلہ سیکنڈری میں کروانا چاہتے تھے، پر تمہارا اسکول پرائمری تک ہی ہے۔ تم اگلے بیچ میں پرائمری اور سیکنڈری دونوں میں داخلے لینا، جگہ اور فرنیچر دونوں ہی ہیں تمہارے پاس، دیکھنا تمہاری آمدنی کیسے بڑھے گی۔''

''آمدنی بڑھے گی تو خرچہ بھی تو بڑھے گا۔'' اُس نے کہا۔

''اس لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تم ان پیسوں کو انویسٹ کر دو۔'' رضا کو اُنکی بات معقول لگی، اُس نے اللہ کا نام لیکر اسی علاقے میں ایک اور بنگلہ کرائے پر لے لیا، اُسے نئے سرے سے تعمیر کروانے کی بجائے، اُس نے اسکی رنوویشن کروانا مناسب سمجھا تھا۔ شیزا کو وہ اپنے ساتھ اسکول لیکر جاتا تھا۔ ذہین بچی تھی، خوشی خوشی پڑھتی تھی۔

ایک روز اسکول سے واپسی پر ایک پرانے سے گھر کے باہر بیٹھی ایک خاتون پر اُسے شناسائی کا گمان ہوا تو وہ رکا۔ اور اگلے ہی لمحے ٹھہر گیا، وہ عائشہ جی تھیں۔ اُسکی پھپھو کی بیٹی، جو اُسے بچپن سے ہی بہت پسند تھیں۔ وہ اُسے بالکل اپنی ماں کی طرح مہربان لگتی تھیں۔ پر وہ یہاں کیا کر رہی تھیں؟ اُس نے چہرہ اُٹھا کر گھر پر لگا بل بورڈ دیکھا۔ وہ ایک دار الامان تھا۔

''عائشہ جی یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' وہ سوچتے ہو گاڑی سے اترا اور انکے پاس چلا آیا۔

''عائشہ جی!'' وہ کچھ اور بوڑھی خواتین کے ساتھ بیٹھی تھیں، حالات بہت اچھے نہیں تھے پر چہرے پر نور ہی نور سمایا ہوا تھا۔

''تم؟'' اُنہوں نے آنکھیں چھوٹی کر کے اُسے پہچاننے کی کوشش کی۔

''تم۔۔۔ تم رضا ہو ناں؟ واصف ماموں کے بیٹے؟'' اُنہوں نے اُسے پہچان لیا تھا۔ بھلا اُسکے علاوہ کون اُنہیں عائشہ جی کہہ کر مخاطب کرتا تھا؟

''ہاں! میں رضا ہی ہوں۔ آپ یہاں کیسے؟ اور کیوں؟'' وہ پنجوں کے بل اُنکے قدموں میں بیٹھ گیا۔ شیزا ساتھ ہی کھڑی حیرت سے اُن دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''تم کہاں چلے گئے تھے بیٹا؟ خاندان والے تو کہتے تھے کہ تم گھر سے بھاگ گئے۔''اُنہوں نے اسکے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں بس۔۔۔۔ تھا کہیں۔۔۔آپ بتائیں! کیا کر رہی ہیں یہاں؟''

''تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں بے اولاد ہوں۔ شوہر کا انتقال ہو گیا تو کوئی وارث نہیں بچا۔ جیٹھ نے گھر پر قبضہ کر کے مجھے یہاں چھوڑ دیا۔''رضا کا دل دکھا۔ یہ دنیا مال و دولت کے لیے اتنی اندھی کیوں ہو گئی تھی کہ آخرت ہی بھول چکی تھی؟

وہ عائشہ جی کو راضی کر کے اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ لے تو آیا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ اُن سب کی کفالت کیسے کرنی ہے؟ بس اللہ پر بھروسہ کر کے اُس نے ہر کام میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اور پھر شاید! اللہ بھی اُس کی آزمائش کرنا چاہتا تھا، اسے متفرق واقعات میں چار مزید بچے ملے تھے، کوئی بچہ دکان پر کام کرتا ملا، جسے اُسکا مالک مار رہا تھا، رضا اُسے قانون سے ڈرا دھمکا کر بچے کو لے آیا۔ کوئی بچہ سڑک پر اکیلے سوتا ملا، تو کوئی بچپن میں اغوا ہو گیا اور اب سڑکوں پر بھیک مانگ رہا تھا۔ اس طرح کر کے اُسکے پاس مزید چار بچے ہو گئے، ایک شیزا اور ایک عائشہ جی۔ کل ملا کر چھے لوگوں کی کفالت کی ذمے داری اُسکے سر پر آ گئی تھی۔ عائشہ جی بخوشی بچوں کو سنبھال رہی تھیں، جس سے رضا کو کافی آسانی ہو گی تھی۔

انہی دنوں گرمیوں کی چھٹیاں قریب آنے لگیں، پہلے سال اُس نے جون جولائی کی فیس معاف رکھی تھی۔ وہ annual چارجز بھی نہیں لیتا تھا۔ پر اب اُسکے پاس پیسوں کی کمی ہونے لگی تھی۔ اسکول کی دوسری برانچ، جس میں اُس نے کام شروع کروایا تھا، اُسے عارضی طور پر روکنا پڑا کہ بچوں کی کفالت اور اسٹاف کو تنخواہ دینا زیادہ ضروری تھا۔

''تم چاہو تو میں ان میں سے کچھ بچوں کی ذمے داری لے سکتا ہوں۔''ہارون صاحب نے اپنی طرف سے اسکا بوجھ کم کرنا چاہا۔

''نہیں ہارون بھائی! میں ان بچوں کو خود پالنا چاہتا ہوں۔''

''تو تم کسی این جی او یا کسی ادارے کی مدد۔۔۔۔''

''ہارون بھائی!''رضا نے سیدھے ہوتے ہوئے اُنکی بات کاٹی۔

''میں ان بچوں کو اپنے پیسوں پر پالنا چاہتا ہوں، یہ میرے بچے ہیں۔ یہ کسی کی خیرات یا زکوٰۃ پر نہیں پلیں گے۔''اُس نے نرمی سے سمجھایا تو ہارون صاحب مسکرا دیئے۔

''اللہ تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔''اُنھوں نے دعا دی۔

دن کچھ مزید سرکے تو اُسے حقیقتاً پیسوں کی تنگی کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر کے بل، اور بچوں کے خرچے الگ تھے۔ وہ اور عائشہ جی تو ایک وقت کھانا کھا کر بھی گزارا کر سکتے تھے۔ پر بچے نہیں! یہ بچے پہلے ہی بہت برے حالات کا سامنا کر چکے تھے، انہوں نے پہلے ہی فاقہ کشی کی زندگی گزاری تھی۔ اب اور نہیں!

اُس روز عائشہ جی نے اسے پریشان دیکھ کر پاس بلایا۔

''یہ کچھ زیورات ہیں میرے پاس، تم انہیں لے لو۔''اُنھوں نے ایک پوٹلی میں بند کچھ کڑے اور کچھ چین لاکٹ وغیرہ اُسکے حوالے کیے۔

''میں یہ نہیں لے سکتا عائشہ جی!''اُس نے گھبرا کر کہا۔

''یہ برے وقتوں کے لیے تھا بیٹا، پر برے وقتوں میں یہ میرے کسی کام نہ آئے۔ ان بچوں کے کام آجائے یہ میرے لیے زیادہ خوشی کی بات ہو گی۔''

''پر یہ آپکے شوہر کی نشانی ہیں۔''اُس نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

''شوہر ہی نہیں رہے تو نشانی رکھ کر کیا کروں گی؟''انکا جواب حتمی تھا۔ رضا نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد وہ زیور لے لیے۔ وہ اتنے زیادہ نہ تھے پر ایک ماہ کا راشن اور بچوں کی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں۔ وہ زیور بیچ کر انکا سامان اور راشن لے آیا۔ پر اسے اگلے مہینے کا نہیں معلوم تھا۔ اسکول کھلنے میں دو ماہ تھے۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کرے گا؟

آخر ایک رات بے بس ہو کر وہ رو پڑا۔ اُسے اپنے گناہ یاد آئے، وہ حرام کام یاد آئے جو وہ مایوسی کی حالت میں کر چکا تھا۔

''یااللہ! آپ نے مجھے ان بچوں کا کفیل بنایا ہے، تو انکا رزق بھی مجھ تک پہنچا دیں۔ میں بنا کسی بے ایمانی کے ان تک پہنچاؤں گا۔ اللہ! آپ ان معصوم بچوں کی خاطر میرے گناہ معاف کر دیں۔ میرے کیے کی سزا انکو نہ ملے۔ یااللہ! میں بہک گیا تھا، گمراہ ہو گیا تھا۔ میں دنیا کی زندگی کو ہی سب سمجھ بیٹھا تھا، یہاں کی ناکامیوں کو آخر سمجھ بیٹھا تھا۔ میں بعد کی زندگی کو بھول گیا تھا یارب! مجھے معاف کر دے۔'' اُس رات اُس نے رو رو کر اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی تھی۔ اُس رات وہ اتنا پریشان تھا کہ اسے ایک بار پھر سے شدید مائیگرین اٹھنے لگا، اُس رات حالت بگڑنے پر اُس نے پہلی بار Benzodiazpines لی تھی، ورنہ اُسکی حالت کافی خراب تھی۔

اگلی صبح اُٹھا تو اُسے نہیں معلوم تھا کہ یہ اُسکی تنگدستی و پریشانی کا آخری دن ہو گا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ اسکول آ گیا، نجانے کیا سوچ کر وہ اسکول آیا تھا؟ بس ایسے ہی وہاں آ کر بیٹھا رہا، کچھ غیر ضروری کاغذات دیکھتا رہا۔ دوپہر ہونے سے پہلے کچھ لوگ اُس سے ملنے آئے۔ رضا نے نہ پہلے انہیں کبھی دیکھا تھا، نہ وہ انہیں جانتا تھا۔

''جی کہیے؟ کیا مدد کر سکتا ہوں آپکی؟'' اُس نے انہیں اپنے آفس میں بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''ہم آپکا اسکول کرائے پر لینا چاہتے ہیں۔'' وہ کل چار آدمی تھے، حلیے سے تو مہذب لگتے تھے۔

''کیا مطلب؟ میرا اسکول کرائے پر دینے کے لیے نہیں ہے۔'' اُسے اُنکی بات سمجھ نہ آئی۔

''میں سمیر باری ہوں، ایس بی پروڈکشنز کا مینیجر۔ ہم ملک کے مشہور اور معروف نجی ٹی وی چینلز کے لیے ڈرامے پروڈیوس کرتے ہیں۔ ہمارے مشہور ہونے والے ڈراموں کی تعداد بہت زیادہ ہیں۔'' وہ اپنا تعارف دیتے ہوئے بولا۔

''ہمم۔۔۔'' رضا نے سر ہلایا۔

''ہم اپنے ایک ہائی بجٹ ڈرامے کی شوٹنگ کرنے والے ہیں۔ ڈرامے کی کہانی اسکول کے اندر ہی گھومتی ہے لہٰذا ہمیں شوٹنگ کیلئے ایک بہترین اسکول چاہیے تھا۔ آپکا اسکول ایک اچھی لوکیشن (مقام) پر ہے۔ اور اسکے علاوہ آپ نے مینٹنین (دیکھ بھال) بھی کافی اچھا کر رکھا ہے۔ لہٰذا ہم یہیں پر شوٹنگ کرنا چاہتے ہیں۔'' اُس نے کہا۔

''بہت شکریہ آپ کا، پر اس سے بچوں کی پڑھائی متاثر ہو گی۔'' اُس نے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم شوٹنگ ابھی سے شروع کر دیں گے، گرمیوں کی چھٹیوں کے اختتام سے پہلے ہمارا ریپ اپ (شوٹنگ کا اختتام) ہو جائے گا۔ اگر کوئی ایک آدھ سین بعد میں کرنے بھی پڑے تو ہم ویک اینڈ پر کر لیں گے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہمارے پاس ایک اچھی پیشکش ہے۔''

''کس قسم کی پیشکش؟'' رضا نے پوچھا۔

''کرایہ ہم آپکو دیں گے ہی اور شوٹنگ کے دوران استعمال ہونے والی تمام بجلی و گیس کا بل بھی ہم بھریں گے، یہ تو اصولی بات ہے۔ البتہ پیشکش یہ ہے کہ، چونکہ ڈرامے کی کہانی اسکول کے گرد گھومتی ہے اور اس میں اسکول کا ذکر بہت زیادہ ہو گا، تو ہم آپکے اسکول کا اصل نام استعمال کر سکتے ہیں، لیکن اسکے لیے پھر آپکو بھی ہماری ایک بات ماننی پڑے گی۔''

''میں سننا چاہوں گا۔'' رضا کو پیشکش اچھی معلوم ہو رہی تھی۔

''کرایہ ہماری مرضی کا ہو گا۔''

''مثلاً کتنا؟'' رضا نے پوچھا، اور جتنا کرایہ اُس نے بتایا وہ رضا کی سوچ سے کہیں زیادہ تھا۔ اُس نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ وہ لوگ بخوشی اُسے اپنا نمبر دے کر چلے گئے۔ اگلے روز اُس نے ہارون صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد انہیں ہاں کر دی۔

شوٹنگ پر آنے سے ایک روز قبل ہی انہوں نے اُسے پہلے مہینے کا کرایہ ادا کر دیا۔ وہ لوگ واقعی بہت پیشہ ور قسم کے لوگ تھے۔ اُس نے پیسوں سے نہ صرف اگلے دو ماہ کا راشن ڈلوایا، بلکہ دوسری برانچ کے رکے ہوئے کاموں کو دوبارہ سے شروع کروا دیا۔

دو ماہ بعد جب شوٹنگ مکمل ہوئی تو اسکے پاس کافی خطیر رقم تھی۔ چند ماہ اچھے سے گزرے، پھر دوسرے بیچ کے داخلے سے پہلے ہی برانچ مکمل تعمیر ہو گئی اور وہاں فرنیچر بھی آ گیا۔ لیکن جس چیز نے رضا کو حیرت میں مبتلا کیا، وہ تھا داخلوں کا نہ رکنے والا سلسلہ۔ پہلی برانچ میں پری پرائمری سے لیکر سیکنڈری تک چار سو بچے داخل ہوئے تھے۔ پرانے والوں کو ملا کر یہ تعداد سات سو ہو گئی تھی۔ رضا کی یہ پہلی برانچ ٹھیک ٹھاک بڑی تھی۔ لہٰذا یہاں آرام سے سات سو بچے آ گئے تھے۔ باقی آنے والے داخلے اُس نے دوسری برانچ میں بھیجنے شروع کر دیئے، دوسری برانچ کے لیے ٹیم بھی جلد سے جلد بھرتی کی گئی۔ لیکن داخلوں کا نہ رکنے والا سلسلہ اتنا زیادہ ہو گیا کہ اسے مجبوراً **ایڈمشن**

کلوزڈ کا بورڈ لگانا پڑا۔ بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ ایس بی پروڈکشن کا ڈرامہ ملک بھر میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا،اور لوگ رضا کے اسکول کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر آنے لگے تھے۔

اسکی آمدنی چند مہینوں میں ہی اتنی زیادہ ہو گئی کہ اُسے اکاؤنٹنٹ،منیجر،اور اپنے ذاتی کاموں کے لیے سیکریٹری تک کو رکھنا پڑ گیا۔وہ حیران رہ گیا کہ چند ماہ پہلے تک اُسکے پاس اگلے ماہ کے راشن کے پیسے نہیں تھے اور اب اُس سے اپنے اکاؤنٹس بھی نہیں سنبھل پا رہے تھے۔یقیناً اُسکا رب صرف ایک معافی پر ہی اتنا نواز دیتا ہے۔

اُس نے داخلوں کی تعداد کو مد نظر رکھتے ہوئے تیسری برانچ پر کام شروع کروادیا،پہلی برانچ کو اسکول کے ہیڈ آفس کا درجہ دے دیا گیا۔اللہ تعالٰی نے بھی اسے جیسے یتیموں کی کفالت کے لیے چن لیا تھا،اسے مزید بچے کفالت کے لیے ملنے لگے،کچھ لوگ خود دے جاتے،کچھ اُسے خود ملتے۔ہر بچے کی آمد کے ساتھ اُسکی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہی چلا جاتا،یہاں تک کہ وہ ششدر رہ جاتا۔اُس نے اپنے بنگلے کی رینوویشن شروع کروادی،گھر کو جدید چیزوں سے آراستہ کیا،ہر طرح کی آسائش بچوں کے لئے مہیا کی اور اسے پناہ گاہ کا نام دے دیا۔اُسکے اسکولوں کی دھڑادھڑ برانچیں کھلنے لگی تھیں،ہر برانچ پچھلی برانچ سے زیادہ پیسہ کما کر دینے لگی تھی۔اُس نے چار سالوں میں ترقی کی تمام منازل طے کر لی تھیں۔دولت اللہ نے اتنی دے دی تھی کہ سنبھالے نہ سنبھلے،پر وہ بھی مغرور نہ ہوا۔جتنا اللہ نوازتا وہ اتنا عاجزو انکسار بنتا چلا گیا۔اپنے سے غریبوں کو وہ اپنے ساتھ ہی بٹھاتا،اسکول کے چپڑاسی،چوکیدار اور صفائی والوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا،اُنکے مسائل سنتا،کبھی کبھار اُنکے ساتھ ہنستا بولتا بھی نظر آتا۔

ایک روز وہ عائشہ جی کے پاس آیا اور انہیں ایک فائل دی۔

''یہ کیا ہے؟''اُنہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جو آپ نے میرے لیے کیا،اُسکا بدلہ میں کبھی نہیں اُتار سکتا۔بس یہ چھوٹا سا تحفہ ہے آپکے لیے۔قبول کر لیجئے۔''اُس نے سر جھکائے کہا تو عائشہ جی نے فائل کھولی اور حیران رہ گئیں۔وہ کسی فلیٹ کے کاغذات تھے۔

''رضا؟''انہوں نے حیرت سے گنگ لہجے میں اسکا نام لیا۔

''یہ بس ایک فلیٹ ہے عائشہ جی، تاکہ آئندہ آپ کبھی بے گھر نہ ہوں۔ چاہیں تو اسے کرائے پر دے دیں، میں کرائے داروں کو ڈھونڈنے کا بندوبست کر دوں گا۔ اس طرح آپکے پاس اپنی ماہانہ آمدنی آتی رہے گی۔''

''پر جو تم ہر ماہ مجھے دیتے ہو؟ وہ کافی تو ہے بیٹا!''

''وہ آپکا حق ہے عائشہ جی! کوئی احسان نہیں کرتا میں۔'' اُس نے کہا تو اُنکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ بچہ اُنکے ایک بار مسکرا کر دیکھنے کو، بچپن میں اُس کے ساتھ نرمی سے پیش آنے والی اپنی اس پھپھوزاد کو نہیں بھولا، تو اگر اسکا باپ اس سے محبت کرتا تو یقیناً یہ اپنا سب کچھ اُس پر وار دیتا۔ عائشہ جی کو یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا کہ بدنصیب وہ تھا یا اُسکا باپ؟

----------+---------+--------

وہ بہت مصروف رہنے لگا تھا، ان اس مصروفیات میں بھی وہ ہارون صاحب کے پاس آنے کا وقت نکال لیا کرتا تھا۔ اُس روز بھی وہ اُن سے ملنے آیا ہوا تھا۔

''میں کبھی کبھار حیران ہوتا ہوں، تم اس وقت چوبیس بچوں کی کفالت کر رہے ہو۔ اور انکے لیے نہ کسی سے قرض لیتے ہو، نہ کوئی فنڈز۔ جو کام کرتے ہو اُسے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیتے ہو۔ پارس ہو تم پارس۔۔۔'' ہارون صاحب نے کہا تو وہ ہلکے سے ہنسا۔

''یہ رزق کا نظام بہت انوکھا ہے ہارون بھائی! ہر انسان کے نصیب کا رزق اللہ نے لکھا ہے اور وہ اُسے پہنچا کر ہی رہتا ہے۔ چاہے وہ اُسے براہ راست پہنچائے یا اُسکے لیے وہ کسی بھی انسان کو ذریعہ بنا دے۔ اور جس انسان کو وہ ذریعہ بناتا ہے اُسکے پاس ہی، اُس شخص کا رزق آتا ہے جو اُسکے زیرِ کفالت ہے۔ یہ سب ان بچوں کا نصیب ہے، یہ انکے حصے کا رزق ہے جو مجھ تک آ رہا ہے۔ اِس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔'' اُس نے عاجزی سے کہا۔

''کمال تو ہے۔ ایک ساتھ اتنے بچوں کی زندگی بدل دینا، اُنکو گھر جیسی محبت اور فضا میسر کرنا، یہ کمال نہیں تو اور کیا ہے؟'' اُنھوں نے کہا۔

''اور ایک ایسے لڑکے کی زندگی بدلنا، جس نے بس خود کو تباہ کر ہی لیا تھا، اسے کیا کہتے ہیں؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہ بیساختہ ہنسے۔

''میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔'' وہ بھی عاجز بندے تھے۔

''آپ خضر بن کر آئے ہیں میری زندگی میں، ایک مسیحا بن کر۔ آپکا احسان تو میں کبھی نہیں اُتار پاؤں گا۔ اگر آخرت میں اعمال میں کمی بیشی ہو، تو میں اپنے تمام نیک اعمال آپکو دینے پر تیار ہو جاؤں گا ہارون بھائی! کہ یہ سب سے کم ہے جو میں آپکے لئے کر سکتا ہوں۔'' اُس نے عقیدت سے اُنکا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''یہ سب نہ کرو، بس جب تم کسی شخص کو بربادی کے دہانے پر دیکھو، تو جیسے میں نے تمہاری مدد کی، تم بھی اسکی مدد کرنا۔ یقین مانو! مجھے اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیے۔'' اُنہوں نے بتایا تو رضا نے اس بات کو گرہ سے باندھ لیا۔

''اوہ ہاں! ایک ضروری بات بتانی تھی تمہیں۔۔۔'' انہیں اچانک ہی یاد آیا تو سر پر ہاتھ مارا۔

''کیا؟''

''وہ تمہارے ڈاکٹر صاحب ہے ناں؟ اُنکے بھائی جامعہ کراچی کے ڈیپارٹمنٹ کے چیئرپرسن ہیں۔ انہیں فوری طور پر وزیٹنگ ٹیچر چاہیے۔ شاید کمیونیکیشن یا مارکیٹنگ کا۔ پر اُسکی تعلیم ایم بی اے ہو۔ انہوں نے مجھے کہا، اور مجھے تم یاد آئے۔''

''لیکن، مجھے نہیں معلوم میں پڑھا بھی سکوں گا یا نہیں؟'' وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

''انٹرویو دینے میں کیا حرج ہے؟'' اُنہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے! دیکھتا ہوں۔'' اُس نے حامی بھری۔

''میں تمہیں نمبر دے دیتا ہوں، تم بات کر لینا۔ جب وہ انٹرویو کے لیے بلائے، جانا ضرور۔'' اُنہوں نے کہا تو اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کچھ دیر اُنکے پاس ہی بیٹھا رہا، اُسکے بعد پناہ گاہ آ گیا۔

-_---------+---------+-------

''میں پہچان گیا تمہیں، تم شاید سن دو ہزار دس یا دو ہزار گیارہ کے بی بی اے کے بیچ میں تھے ناں؟'' اُسکا انٹرویو لینے کے بعد چیئرپرسن نے کہا۔

''ہاں! پھر میں نے ایم بی اے بھی کیا تھا،اسی ڈیپارٹمنٹ سے۔''اُس نے بتایا۔

''تو رضا! کیا تم اگلے مہینے سے ہمیں بطور وزٹنگ فیکلٹی جوائن کر سکتے ہو؟''اُنہوں نے پوچھا۔

''ہاں! بالکل۔۔۔''اُس نے مختصر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، میں اگلے ہفتے تک آفر لیٹر میل کر دوں گا۔''اُنہوں نے کہا، پھر رضا اُن سے مصافحہ کر کے باہر نکلا۔

وہ صبح آٹھ بجے یہاں آیا تھا۔ ڈیپارٹمنٹ کے کاریڈور اس وقت سنسان پڑے تھے۔ سیمسٹر شروع ہونے میں ایک ماہ تھا، لیکن نجانے کیوں؟ اسے لگا جیسے جامعہ بھری ہوئی ہو؟ کاریڈور سے گزرتے خالی کلاسوں کی خالی کرسیاں، جن پر کھڑکیوں سے چھن کر آتی صبح کی دھوپ پڑ رہی تھی، یکدم ہی طلبہ وطالبات سے بھری بھری لگنے لگی تھی۔

استاد صاحب بورڈ پر کھڑے ہو کر کچھ پڑھا رہے تھے۔ سال دو ہزار دس کی تاریخ بورڈ پر لکھ رکھی تھی۔ راہداری میں کھڑے رضا نے کلاس کے پیچھے والے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں وہ چھ وجود کھڑے آپس میں سرگوشی کر رہے تھے۔ وہ کلاس میں پہنچنے میں لیٹ ہو چکے تھے۔ اب اندر جانے کے طریقے پر غور وخوص کر رہے تھے۔

جب یاد کا قصّہ کھولوں تو کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

میں گزرے پل جو سوچوں تو کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

''حسین! وہاں کیا کر رہے ہو؟''استاد صاحب کی نظریں حسین پر پڑ گئیں۔ اب حسین حیلے بہانے بنا رہا تھا۔ اور استاد صاحب بھی بڑی فرصت سے اسکا ہر ایک بہانہ رد کر رہے تھے۔ کلاس کے باقی سٹوڈنٹس لطف اندوز ہوتے ہنس رہے تھے، رضا مسکرایا تھا۔

اور یکدم ہی استاد صاحب کا عکس ہوا میں تحلیل ہوا پھر ایک ایک کر کے سب غائب ہونے لگے۔ اُس نے چہرہ گھما کر دوبارہ دیکھا، اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ راہداریاں خاموش تھیں، کلاس خالی اور اُسکا دل بھی خالی۔۔۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھا، اور راہداری سے باہر نکل آیا۔

باہر باغ میں بنے ریمپ کے پاس پھر سے مجمع لگنے لگا تھا۔ حسین صاحب جماعت کے لڑکوں کو ارد گرد کھڑا کیے، انکا ہاتھ دیکھتے اُنکے مستقبل کی پیشن گوئیاں کر رہے تھے۔ پاس بیٹھا رضا بیزار ہو رہا تھا۔

''یہ تم سب کو بیوقوف بنا رہا ہے، کوئی ہاتھ دیکھنا نہیں آتا اسے۔۔۔'' کہیں سے علی نمودار ہوتا اسکے دھندے پر پانی پھیر چکا تھا۔

''ہم جانتے ہیں، ہم بھی وقت گزاری کر رہے ہیں۔'' کسی لڑکے نے جواب دیا تھا۔

''میری صلاحیتوں کو تم نے وقت گزاری کہا؟ چلو نکلو یہاں سے۔۔۔'' حسین نے تڑپتی ہیروئن جیسا منہ بنا کر کہا تھا۔

کچھ باتیں تھیں پھولوں جیسی، کچھ لہجے خوشبو جیسے تھے

میں تنہا چمن میں ٹہلوں جو تو، کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

باغ خالی ہونے لگا، منظر مٹنے لگے، یادیں گم ہونے لگیں۔ رضا پھر سے اکیلا رہ گیا۔ اُس نے خود کو گہری سانس لیکر پر سکون کیا اور تیزی سے اپنی نئی گاڑی کے پاس پہنچا تاکہ جلد از جلد یہاں سے نکل سکے۔ لیکن ایسا ناممکن لگ رہا تھا۔ وہاں پارکنگ میں اُسکا خود کا عکس اپنی تباہ حال بائیک کو سٹارٹ کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ قریب کھڑا عمر اُسکی ہر ممکن مدد کر رہا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ گیا، اصولاً تو اسے مسکن گیٹ سے نکل جانا چاہیے تھا، لیکن وہ نجانے کیوں سلور جوبلی کے راستے پر چل نکلا؟ اُس پر سے مزید بر آں وہ سائنس والی سائڈ آ گیا۔ سیمسٹر بریک ہونے کی وجہ سے بہت کم لوگ دکھ رہے تھے، زیادہ تر پی ایچ ڈی والے یا وہ جنہیں اپنے کاغذات کے حوالے سے کوئی کام تھا، وہی آئے ہوتے تھے۔ وہ سست روی سے گاڑی چلاتے ایک ایک کونہ دیکھ رہا تھا، ایسے جیسے کہیں سے اسکے دوست نکل آئیں گے۔ وہ تو نہ تھے پر اُنکے عکس نظر آ رہے تھے۔ روڈ پر بھاگتی شٹل کو دیکھ کر حسین آہیں بھر رہا تھا کہ اُس میں ہمہ وقت لڑکیوں کا قبضہ رہتا تھا، عمر یہیں کہیں کسی انجان طالب علم کی مدد کر رہا تھا۔ سامنے کیمسٹری کینٹین میں بیٹھے وہ لوگ، صبح کا ناشتہ کرنے کے انتظار میں تھے، بحث اس بات پر ہو رہی تھی کہ کون جا کر آرڈر دے گا؟ عمر اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے پر تول رہا تھا لیکن مقدم اُسے ہر بار آنکھیں دکھا کر چپ کروا دیتا۔ نوید بھاگ کر سڑک پار کر رہا تھا، اُسکی منزل بس ٹرمینل تھا، تاکہ وہ اپنے علاقے کے پوائنٹ میں اپنی سیٹ پر قبضہ کر سکے۔

وہ گاڑی موڑ کر سلور جوبلی جانے والی سڑک پر آ گیا، راستے میں آرٹس کے ڈیپارٹمنٹ تھے، ایم بی اے کے آخری سالوں میں وہ لوگ علی، عمر اور نوید سے ملنے یہاں آتے تھے، آرٹس لابی میں بیٹھتے تو کبھی ایسے ہی درختوں کے نیچے قیام کرتے وقت گزر جاتا، پھر اپنی کلاسیں

شروع ہونے کا احساس ہوتا تو اندھا دھند بھاگتے۔ غرض اس جامعہ کے کونے کونے پر یادوں کا انبار تھا جو شاید کبھی ختم نہیں ہونے والا تھا۔

پتہ نہیں سب لوگ کہاں ہوں گے؟ کس حال میں ہوں گے؟ کسی کی کچھ خبر نہ تھی۔

کچھ باتیں تھیں پھولوں جیسی، کچھ لہجے خوشبو جیسے تھے۔

میں تنہا چمن میں ٹہلوں جو تو، کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

انہیں سوچتے ہوئے وہ جامعہ سے باہر آ گیا لیکن ابھی ایک اور امتحان باقی تھا۔

آج اسے اپنے گھر جانا تھا، وہ گھر جہاں اُسکا بچپن اور اسکا لڑکپن گزرا تھا۔ جہاں کب سے ماموں کا قبضہ تھا۔ ماموں کو عدالت کی جانب سے ایک سال کا اسٹے ملا تھا، لیکن اب اس میعاد کو پورے ہوئے بھی ڈیڑھ سال گزر چکے تھے، وہ ڈھائی تین سالوں سے اُس گھر میں مقیم بیٹھے یہ سمجھے تھے کہ رضا بھول گیا ہوگا۔ پچھلے دو سالوں میں اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے وہ وہاں جا نہ سکا تھا، لیکن بھولا کچھ نہ تھا۔ اُس نے پولیس کو فلحال فون نہیں کیا تھا، لیکن اُسکا پورا ارادہ تھا کہ اگر یہ لوگ ذرا بھی ڈانوں ڈول ہوئے تو وہ پولیس کے ذریعے انہیں دھکّے مار کر باہر نکلوائے گا جیسے اُنہوں نے اسے گرفتار کروایا تھا، وہ کسی پر رحم نہیں کھائے گا۔ یہ اُسکا قانونی حق تھا۔

----------+---------+------

آج اس محلّے میں قدم رکھتے ہوئے اسے کوئی ڈر نہ تھا۔ یہ دنیا پیسے والوں کی عزت کرتی ہے اور پیسہ اب اُسکے پاس تھا۔ گاڑی سے اتر کر دروازے کی بیل بجاتے ہوئے نہ اسے کوئی خوف تھا نہ شرمندگی۔ بیل کی آواز پر چوکیدار نے دروازہ کھولا، وہی پرانا چوکیدار تھا۔ رضا کو اچھے سے پہچانتا تھا۔ بنا کسی سوال وجواب کے اور بنا ایک لمحہ بھی سوچے، اُس نے فوراً دروازہ وا کیا اور اسے اندر جانے دے دیا۔

اندر آیا تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا، گھر کی آدھی سے زیادہ لائٹیں بند تھیں، صرف لاؤنج کی لائٹ کھلی تھی، جہاں ماموں وہیل چیئر پر بیٹھے تھے، اگر انہیں اُسکی آمد کی اطلاع ہوتی تو وہ یقیناً اسے ڈرامے بازی قرار دینے والا تھا۔

"رضا؟ تم۔۔۔" اسے دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔ ماموں کی چھوٹی بیٹی پاس ہی بیٹھی تھی۔ ہاتھوں میں کھانے کا پیالہ تھامے وہ انہیں اس میں رکھی شے چمچ کے ذریعے کھلا رہی تھی۔

کک۔۔۔ کیسے آنا ہوا؟‘‘اُنہوں نے پوچھا۔

’’کیا آپ نہیں جانتے میں کیوں آیا ہوں؟ بہت رہ لیا میرے گھر میں، اب اسے خالی کریں۔‘‘ ابتدائی حیرت اب ختم ہو چکی تھی، لہٰذا وہ نفرت سے گویا ہوا۔ ویسے بھی وہ حیرت ہی تھی، ہمدردی تو نہیں۔۔۔ رضا کو تو ایسا ہی لگتا تھا۔

’’میرا بیٹا۔۔۔ وہ میرا کاروبار بیچ کر۔۔۔ ملک سے فرار ہو گیا ہے۔ اور مجھے یہاں تنہا چھوڑ گیا ہے۔‘‘ کہتے ہوا اُنکا لہجہ بھرایا۔ ’’میں اب اپنے گھر سے آنے والے کرائے سے ہی گزر بسر کر رہا ہوں۔ بہت مشکل میں ہوں میں۔‘‘ انہوں نے بتایا۔

’’تو؟‘‘ رضا کے جوتوں کو بھی فرق نہ پڑا تھا۔

’’ابّا کو ہارٹ اٹیک آیا ہے رضا! اسکے بعد انہیں عارضی طور پر فالج ہوا ہے۔ ٹھیک ہو جائیں گے مگر وقت لگے گا۔‘‘

’’تو؟‘‘ اس بار اُس نے چبا چبا کر بلند لہجے میں کہا۔

’’تو ہمیں۔۔۔ ہمیں تھوڑا سا وقت دے دو۔‘‘ اُس نے ہچکچاتے ہو کہا۔

’’ڈھائی سال کافی نہیں ہیں؟‘‘ وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

’’میں جانتا ہوں، پر اس وقت میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔ میری ہر شے پر میرے بیٹوں نے قبضہ کر لیا ہے۔‘‘ ماموں نے التجائیہ انداز اپنایا۔ رضا گہرا سانس لیکر سامنے رکھے صوفے پر بیٹھا، دائیاں بازو صوفے کی پشت پر پھیلایا، اور ٹانگ پر ٹانگ چڑھالی۔

’’تو کیا ہوا؟ ہمیشہ آپ قبضہ کرتے تھے؟ اب اُن دونوں نے آپ کی روایات کو برقرار رکھ لیا تو کیا برا کیا؟‘‘ اُسکا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا تھا۔

’’میں تمہیں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں گھر واپس نہیں دونگا، بلکہ۔۔۔‘‘

’’آپ یہ کہہ بھی نہیں سکتے۔‘‘ اُس نے اُنکی بات کاٹی۔

’’ہاں! میں یہ کہہ بھی نہیں رہا، میں بس مہلت مانگ رہا ہوں۔‘‘ آج اُنکے لہجے میں نہ رعونت تھی، نہ اکڑ۔۔۔ بس التجا تھی۔

''اور میں کیوں دوں''اُس نے سکون سے کہا۔

''میں اپنے پرانے گھر چلا تو جاؤں پر، پھر کرایہ نہیں آیگا تو میں کیسے گزارا کروں گا؟''

''آپ کے مسائل سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا گھر خالی کریں، چاہیں جا کر اپنے پرانے گھر میں رہیں یا سڑک پر۔''

''رضا! تمہارے پاس تو اتنی دولت ہے، اگر تم یہ گھر کچھ روز میرے پاس رہنے دو گے، کہ میری بیٹیوں کی شادیاں ہو جائے، تو تمہیں کیا فرق پڑ جائے گا؟''انہوں نے لجائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اسکے لباس، اُسکی شخصیت، اُسکی ایک ایک شے سے چھلکتی امارت اُسکی دولت کا پتہ دے رہی تھی۔

''میں آپکے لئے آسانی کیوں کروں؟ میری ذات کو واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن آپکو ذلیل ہوتا دیکھنا میری خواہش ہے۔''وہ تلخ مسکراہٹ کے ساتھ ذرا آگے کو ہو کر گویا ہوا۔ اُسی لمحے اُسکی نظریں اپنی ماموں کی بیٹی پر پڑیں، وہ لمحے بھر کو ساکن ہوا۔ اُس سترہ سالہ لڑکی کی آنکھوں میں رضا کے لیے وہی نفرت سر اُٹھا رہی تھی، جو کبھی اُسکی اپنی آنکھوں میں ماموں کے لیے ہوتی تھی۔ اس بچی کی جگہ اسے اپنا آپ بیٹھا نظر آیا، تو کیا وہ ایک اور رضا کو پروان چڑھانے والا تھا؟ کیا وہ کسی اور کی زندگی برباد کرنے کا سبب بننے والا تھا؟

''تم مجھے اپنی ماں کے واسطے یہاں رہنے دے دو۔''ماموں کی آواز پر وہ ہوش میں آیا۔

''اپنی ماں کے واسطے یہاں۔۔۔''وہ بولتے بولتے رونے لگے۔ رضا کو کوئی فرق نہ پڑا، کوئی دکھ نہ ہوا، کوئی ہمدردی دل میں نہ جاگی۔

''اپنی ماں کے واسطے۔۔۔اور صرف اور صرف اپنی ماں کے ہی واسطے، میں آپکو فقط چند سالوں کا وقت دے رہا ہوں۔ اتنا وقت جتنے وقت میں آپکی بیٹی اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے۔ اُسکے بعد اگر آپ یہاں سے نہیں گئے، تو میں واپس آؤں گا۔ اور دھکّے مار کر باہر نکالوں گا۔''اُسکے لہجے میں اِس سے زیادہ رحم نہیں آسکتا تھا، وہ بھی اس آدمی کے لیے۔

''ابھی جانے سے پہلے میں گھر دیکھوں گا۔''وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''بیٹی! جاؤ رضا بھائی کو گھر دکھادو۔''اُنہوں نے خوش ہوتے ہوئے کہا، گھر میں رہنے کی مہلت جو مل گئی تھی۔

''مجھے میرے گھر کے تمام راستے معلوم ہیں، میرے پیچھے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''اُس نے درشتی سے جواب دیا تو اُنکا منہ اُتر گیا۔

وہ لاؤنج سے ہوتا اندر کی جانب بڑھا، اس گھر سے اسکی کوئی اچھی یادیں تو نہ جڑی تھیں، پر جیسی بھی تھیں، تھی تو یادیں ہی۔۔۔

اندر کی جانب اُسکی پہلی نظر ڈائننگ ہال میں پڑی۔ کھانے کی میز خاموش پڑی تھی، لیکن اب وہاں اُسکے ابو، امی اور دادی بیٹھے تھے۔ اُسکے ابّو ہمیشہ کی طرح اُسکی ماں کو دل دکھاتے، چبھتے جملے بول رہے تھے، اور اسکی دادی اُسکی ماں کا دفاع کر رہی تھیں۔ اُسکی ماں ہمیشہ کی طرح خاموشی سے ناشتہ میز پر لگا رہی تھیں، جیسے وہ روبوٹ ہوں۔

یہیں پہ تھا میرا بچپن، یہیں کہیں پہ تھا

یہیں ہنسا تھا، یہیں کہیں پر رویا تھا

وہ ڈائننگ حال سے منسلک باورچی خانے میں آ گیا، جہاں چولہے کے سامنے کھڑی اُسکی سانولی صورت اور مہربان مسکراہٹ والی ماں کھڑی پکوڑے تل رہی تھیں۔ چار سالہ رضا اُنکے پیروں سے لپٹا، ہاتھوں میں انکے دوپٹے کا آنچل دبوچے کھڑا تھا۔ ایسے جیسے وہ اُسے چھوڑ کر کہیں چلی جائیں گی۔

یہیں درختوں کے سائے میں، تھک کر سویا تھا

باورچی خانے کا پچھلا دروازہ کھول کر وہ لان میں آ گیا۔ درخت اور پودے سوکھ چکے تھے، گھاس پر بکھرے پتے اسی کی طرح اپنی کم مائیگی کی داستان سنا رہے تھے۔ پر تھوڑا دور کھڑا وہ درخت آج بھی ہرا بھرا تھا، یا شاید رضا کو ایسا لگ رہا تھا۔ اُسی درخت کے نیچے رکھی مسہری پر اُسکی ماں پاؤں پھیلائے بیٹھی تھیں، اُنکی گود میں چھے سالہ رضا سر رکھے لیٹا کہانیاں سن رہا تھا۔

یہیں پہ جگنو سے اپنی بات چلتی تھی

وہ ہنسی جو ہر پل ساتھ چلتی تھی

درخت سے ہوتے اُسکی نظریں اس پرانے کوارٹر پر گئیں، جو آج بھی خستہ حال تھا۔ لیکن اب اپنے مکین کے نہ ہونے پر کسی آسیب زدہ گھر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اُسکے حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹک گیا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے وہ کوارٹر تک گیا۔ دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ خود ہی کھل گیا۔

یہیں پہ تھا وہ لڑکپن، یہ کہیں پر تھا

وہ کوارٹر کے اندر آیا تو ہر شے مٹّی کی دبیز تہہ کے ساتھ ویسی ہی تھی جیسی وہ چار سال قبل چھوڑ کر گیا تھا۔ اُسکے جانے کے بعد کسی نے اس قید خانے کو دیکھنا بھی پسند نہ کیا تھا۔ اُسکا ٹوٹا پھوٹا سا بستر، ساتھ میں رکھی چھوٹی سی الماری، بوسیدہ سی چادر، چھوٹا سا سلنڈر جس پر وہ کبھی کھانا بنایا کرتا تھا سب اپنا اپنا سا الگ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے اپنے بستر پر آ بیٹھا، یہ پلنگ اُسکے برے وقتوں کا ساتھی تھا۔ اُس نے مٹی میں اٹا تکیہ اٹھالیا۔ اس تکیہ نے اُسکے کتنے آنسو اپنے اندر جذب کیے تھے؟ رات جب وہ اپنی ماں کو یاد کیا کرتا تھا، تب یہ تکیہ ہی اسکو گلے سے لگاتا تھا۔

یہیں پر ماں مجھ کو سینے سے لگائے رکھتی تھی

یہیں پہ تھا وہ لڑکپن یہیں کہیں پہ تھا

اُس نے اٹھ کر الماری کھول دی۔ اُسکے پرانے کپڑے ویسے ہی رکھے تھے، اُسکی کتابیں، اُسکا بیگ۔۔۔ وہ ایک ایک شے نکال کر دیکھ رہا تھا۔ اُسکے کاغذات جسکی اب اسے ضرورت نہ رہی تھی کہ ہارون صاحب نے اسے ڈپلیکیٹ نکلوا دیے تھے۔ ہر شے کو دیکھتے اُسکی نظریں یکدم ہی اُس گتے کے ڈبّے پر گئیں۔ بھلا یہ کیا ہے؟ اُس نے دل میں سوچا اور ڈبہ باہر نکال دیا۔

پلنگ پر ڈبہ رکھ کر غور سے دیکھا، پھر اسے کھولا۔ جیسے ہی اندر رکھے سامان پر نظریں پڑیں ذہن کو ایک جھماکے سے سب یاد آ گیا۔ اندر دو عدد پیک شدہ شرٹ اور پینٹ تھیں۔ اسے یاد آ گیا، اچھے سے یاد گیا کہ یہ کس نے دی تھیں؟ ان کپڑوں میں سے ایک جوڑا وہ انٹرویو والے روز پہن کر گیا تھا۔ پر اُس روز جو ہوا اسکے بعد رضا کو باقی جوڑوں کو ہاتھ لگانے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ اُسکے چہرے پر اُداس سی مسکان آ گئی۔

ہاتھ بڑھا کر کپڑے باہر نکالے، ساتھ وہ پرچی بھی نکالی، جسے حسین نے رقعے کے طور پر بھیجا تھا۔ اُسکی لکھائی آج بھی واضح تھی۔

رائل کلرز تم پر اچھے لگتے ہیں۔

یہ ایک جملہ اسے ہمیشہ یاد رہ گیا تھا۔ اور رضا الٰہی اُسکے بعد سے لاشعوری طور پر زیادہ تر رائل کلرز ہی پہنتا تھا۔ اُس نے رقعہ کسی متاعِ حیات کی طرح سنبھال کر جیب میں رکھ لیا۔ اور وہ ڈبہ بھی ساتھ اٹھالیا۔ اس گھر سے صرف یہی ایک شے تھی جو وہ لیکر جا رہا تھا کہ وہ اُسکے ایک عزیز کی نشانی تھی۔ اُسکے پیارے دوست حسین کا تحفہ۔۔۔

اس دن کے بعد سے اُس نے اپنے ماموں کو تنگ کرنا نہیں چھوڑا، ہر پانچ چھے مہینے میں وہ انہیں یاد دلانا نہیں بھولتا کہ وہ جلد واپس آئیگا اپنا گھر لینے، بہتر ہے کہ وہ انتظام کر لیں۔

ہارون صاحب کی نصیحت کو پلو سے باندھے، اُس نے ان دو چرسیوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جن میں سے ایک نے اسے ایک رات سوکھی روٹی کا ٹکڑا لا کر دیا تھا، یہ وہی تھا جس نے اسے نشے میں لگایا تھا۔ دوسرا وہ جس نے اسے ایک روز بوری لا کر دی تھی تاکہ وہ روٹیاں اور ردی چن کر کچھ پیسے کما لے۔ چار سال بعد جب وہ آیا تو یقیناً وہاں بیٹھے کسی چرسی نے اسے پہچانا نہیں تھا، کچھ چہرے پرانے تھے اور کچھ نئے۔ اُس نے ان سب سے اسی چرسی کے بارے میں معلوم کرنا چاہا تو پتہ لگا کہ اُسکا سر پھٹ گیا تھا، کسی نے اسکا علاج نہیں کروایا تو وہ اسی زخمی سر کے ساتھ کئی ماہ زندہ رہا۔ اُسکے زخم کو کیڑے کھانے لگے تھے، اس میں سے خون بھی رستا تھا۔ جب کیڑوں کے کھانے سے اُسے تکلیف اٹھتی تو وہ پاگلوں کی طرح چیختا یہاں تک کہ نشہ ہی اسے خاموش کرواتا تھا۔ اور ایک روز وہ اسی اذیت کے ساتھ مر گیا۔ کوئی نہیں آیا، نہ حکومت کا کوئی کارندہ، نہ کوئی ریسکیو والا۔ بس ایدھی والوں نے اسکی لاش پر رحم کھایا اور غسل وتدفین کر دی۔ اس روز رضاالٰہی وہاں بیٹھ کر دھاڑے مار مار کر رویا تھا۔ اس ایک چرسی کے غم میں، جس سے اسکا کوئی رشتہ نہ تھا۔ پر اسکو دکھ اس بات کا تھا کہ وہ اُسکے لیے کچھ کر نہ سکا۔ اُس روز وہ سمجھ گیا کہ ہارون صاحب کیوں اُس کو چھوڑنے پر راضی نہ تھے؟ وہ بھی اسی شرمندگی سے نکلنا چاہتے تھے، جس میں آج رضا گھر گیا تھا۔ اُس نے اپنے ہی ڈاکٹر سے رابطہ کیا اور وہاں بیٹھے تمام چرسیوں کو، جو تعداد میں پانچ یا چھے تھے، انہیں بھلا پھسلا کر نشے کے علاج کے لیے ادارے میں داخل کروا دیا۔

بہت مشکلوں سے ہی صحیح پر وہ اس ردی چننے والے کو ڈھونڈنے میں بھی کامیاب ہو گیا، اور بلآخر اسے بھی علاج کے لیے داخل کروا دیا۔ ان سب کا علاج رضا سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوا تھا۔ کوئی دورانِ علاج چل بسا، کسی نے خود کو نقصان پہنچایا، لیکن آہستہ آہستہ وہ اُن سب کو نارمل زندگی پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ کے گھر والے مل گئے اور ساتھ لے گئے، کچھ کے اندر جینے کی امنگ جاگ اٹھی تو کچھ نے چھوٹی موٹی مزدوری یا کام شروع کر دیا، جس میں رضا اور ہارون صاحب نے انکی بھرپور مدد کی تھی۔

"اگر آپ میرا علاج نہ کرواتے تو آج میں ان سب کا علاج کروانے کے قابل نہ ہوتا۔ یہ سب آپکے لئے صدقہ جاریہ بنیں گے ہارون بھائی!"، جس روز اُس نے روٹی چننے والے آدمی کو مکمل علاج کے بعد اپنے اسکول کی ایک برانچ میں صفائی ستھرائی کے لئے رکھا اور اسے خوش دلی سے کام کرتے، پھر وضو کر کے نماز کے لیے جاتے دیکھا، اُس روز اس نے ہارون صاحب کو میسیج کر کے دل سے یہ کہا تھا۔

''میں نے تو بس تمہارا ہی علاج کروایا تھا، پر تم نے اتنے ساروں کی زندگی بدلی ہے۔ یہ صرف میرے لیے نہیں، بلکہ تمہارے لیے بھی صدقہ جاریہ ہیں رضا!'' انہوں نے جواب دیا تھا۔

اسکی زندگی اسی طرح گزر رہی تھی، وہ اور ہارون صاحب سالانہ ایک نشہ کرنے والے کے علاج کا پیسہ اُس سینٹر میں دیتے اور انہیں کہتے کہ اُنکے بدلے وہ کسی سڑک چھاپ چرسی یا نشئی کو اٹھا کر اُسکا خود علاج شروع کر دیں۔ اُسکی زندگی بس وہ لوگ اور پناہ گاہ کے بچے ہوتے تھے۔ دس سالوں میں پناہ گاہ کا سب سے بڑا بچا جو اسے چودہ سال کی عمر میں ملا تھا، اب وہ تعلیم حاصل کرنے اسکالرشپ پر بیرون ملک جا چکا تھا۔ رضا کو ویڈیو کال کر کے بات کرنا وہ آج بھی نہیں بھولتا تھا۔ ایک بچی جو اسے تب ملی تھی جب وہ خود سولہ سال کی تھی، آج دس سال بعد امریکا میں بیٹھی انسانی نفسیات کے ریسرچ اسٹوڈنٹ میں شامل تھی۔ وہ آج بھی جب اپنا کوئی سامان یہاں وہاں رکھ کر بھول جاتی تو گھبرا کر پہلا فون رضا کو کرتی، پھر عائشہ جی بیچاری اسے ہر وہ ممکنہ جگہ بتاتیں، جہاں وہ اپنی اہم چیز رکھ کر بھول چکی تھی۔

اس نے ان ٹوٹے دلوں میں اپنی دنیا بسائی تھی، اُن مایوس لوگوں کو مایوسی سے نکالا تھا۔ وہ اپنے رب کی مخلوق کو نہیں بھولا تو بھلا مخلوق کا خالق اسے کیسے بھول سکتا تھا؟

اس نے مخلوق سے محبت کی تھی۔۔۔

اور خالق نے یقیناً اس سے۔۔۔

----------+---------+--------

رمضان کا پہلا روزہ اور دوسری سحری والی رات:

حسین کے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے، وہ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے، کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکائے بیٹھا تھا۔

''بس! معلوم بھی نہ ہوا اور زندگی کے اتنے سال نکل گئے۔'' رضا نے بات مکمل کر لی تھی۔ حسین خاموش تھا۔

''حسین؟'' اُس نے اُسکا کندھا ہلایا۔

''دور رہو مجھ سے۔۔۔'' حسین نے اُسکے ہاتھ جھٹکے تو وہ دکھی ہوا۔

''حسین! میں نے جان کر ایسا نہیں کیا تھا۔''اُس نے کوئی وضاحت دینا چاہی۔ جواباً وہ خاموش رہا۔

''میں اب بہتر ہوں، اچھی زندگی گزار رہا ہوں۔''اسے خاموش دیکھ کر اُس نے دوبارہ کہا۔

''تو؟ کیا کروں پھر میں؟''وہ جیسے کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھا۔ اب کہ رضا چپ رہا۔

''یعنی میں گدھا تھا جو اتنے عرصے تمہیں دوست سمجھتا رہا، تم نے تو مجھے کسی لائق ہی نہ سمجھا۔ مجھ سے کیا بدگمانی تھی تمہاری؟ مجھے تو بتا سکتے تھے؟ میں اتنا غیر اہم تھا؟ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنی دوستی ثابت کرنے میں ناکام رہا۔''اُس نے بھیگے لہجے میں کہتے آنسو صاف کیے۔

''ایسی بات نہیں ہے، تم ہی میرے دوست ہو۔''

''غلط! نہیں ہوں میں تمہارا دوست، نہ کبھی تھا۔ ورنہ تم میرے اوپر بھروسہ کرتے۔''

''مجھ سے غلطی ہو گئی۔ علی کا اِس جھگڑے میں کوئی قصور نہیں ہے، سراسر قصور میرا ہے۔ میں نہ کرتا ایسا تو ہم بعد میں علی اور نوید کو سمجھا لیتے، عمر کو بھی نہ جانے دیتے بلکہ اُسے بٹھا کر اُس کا مسئلہ پوچھتے کہ اُس نے ایسا فیصلہ کیوں کر لیا؟ لیکن میں نے سب خراب کر دیا۔''وہ شرمندہ تھا۔

''کاش! میں تمہیں اس رات اکیلا نہ چھوڑتا تو ایسا نہ ہوتا۔''حسین کو افسوس ہوا۔

''تمہارا قصور نہیں ہے۔''

''صحیح بات ہے، میرا قصور واقعی نہیں ہے۔ تم ہی عقل سے پیدل ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''اُس نے ناراضگی سے کہا تو وہ ہنس دیا۔

''ہنسو مت! میرا شکریہ ادا کرو کہ میری وجہ سے تم آج یہاں تک پہنچے ہو۔''اُس نے نروٹھے انداز میں کہا۔

''تمہاری وجہ سے؟''رضا نے تڑپ کر اُسے دیکھا۔

''ہاں! اگر میں اُس روز تمہیں اکیلا نہ چھوڑتا تو تم چرسی نہ بنتے اور نہ ہی ہارون صاحب تمہیں ملتے اور نہ تمہاری جائیداد تم حاصل کر سکتے۔ تو بلآخر ان تمام باتوں کا سہرا میرے سر۔''اس نے فخر سے گردن تانی۔

"تالیاں۔۔۔"رضا نے مصنوئی شاباشی اسے دی تھی۔

وہ رات گزر گئی۔۔۔

اس رات کا قصّہ گو خاموش ہو گیا۔۔۔

اور وہ منظر آج میں بدل گیا۔۔۔

سورج نکل آیا تھا، روشنی بھی سارے میں پھیل چکی تھی۔ صبح کی ہلکی دھوپ میں سمندر چمک رہا تھا۔ حسین خاموش ہو چکا تھا، لیکن نجانے کتنے ہی وجود کو انجانے پچھتاؤں میں ڈال گیا تھا؟

اگر تم یہ بات جانتے کہ یہ شخص اپنے شوق کے لیے اُس مجرم سے نشہ خرید تا تھا تو کبھی بھی میرے شک کو غلط نہ سمجھتے۔

اگر علی سفیر کے اختیار میں ہوتا تو وہ زمین کی سات تہوں میں خود کو دفن کر لیتا۔ اُس نے کتنے آرام سے اسکا تکلیف دہ ماضی موضوع گفتگو بنایا تھا، کتنے آرام سے؟

کیا تم ایسے آدمی پر بھروسہ کرنا چاہتے ہو جو ڈرگ ایڈکٹیڈ (عادی نشئی) ہے۔

اپنی آواز اب ہر جگہ سنائی دے رہی تھی۔ اپنا زہر میں ڈوبا لہجہ اب محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ہمیشہ بعد میں پچھتاتا تھا، وہی اُسکا مقدر تھا۔ لیکن پچھتاوا ابھی کا نہیں، پچھلے دس سالوں کا تھا۔ اگر وہ صنوبر کے واقعے کو جنون کی حد تک سر پر سوار کرنے کے بجائے، تھوڑی دیر تحمل سے اپنے دوستوں کی بات بھی سن لیتا تو یہ سب نہ ہوتا۔ پر اب وہ کس سے کہتا؟ کیسے مداوا کرتا؟ رضا تو تھا ہی نہیں؟ دنیا میں تھا بھی یا شاید؟ اس سے آگے اس سے سوچا نہیں جا رہا تھا۔

گیارہ سال بعد آج عمر حفیظ پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ رات رضا جیل میں گزار کر، خود پر تشدد سہہ کر آیا تھا۔ کاش! اس روز عمر اُس سے پوچھ لیتا، کاش! وہ زبردستی ہی اس سے پوچھ لیتا۔ پر اب کیا فائدہ؟

اُس جگہ کھڑے رضا الٰہی کے پانچوں دوست الگ الگ پچھتاؤں کا شکار تھے۔ پر رضا اب اُن سب کی ہی پہنچ سے بہت دور جا چکا تھا۔

----------+---------+--------

ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں، بندر گاہ سے دور وہ اس کنارے پر آگیا تھا، جہاں سمندر گہرائی لیے ہوئے تھا۔

اُس لمحے وہ اپنی پوری زندگی یاد کر رہا تھا۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔۔۔

ماں کا سسکتے سسکتے گزر جانا یاد آیا۔۔۔

دوسرا آگے بڑھایا۔۔۔

باپ کا چھوڑ جانا یاد آیا۔۔

مزید قدم آگے کیے تو سمندر کے مزید قریب ہو گیا۔۔۔۔

جیل کے ٹھنڈے فرش پر گزاری وہ رات یاد آئی۔۔۔

سمندر بس کنارے پر ہی تھا۔۔۔

ماموں کی بے اعتنائی یاد آئی۔۔۔

دنیا اس پر پہلے ہی تنگ تھی پر آج جیسے ختم ہو گئی تھی۔۔۔۔

ایک اور قدم آگے بڑھایا۔۔

علی کے لگائے گئے الزامات، اور حقارت آمیز لہجہ یاد آیا۔۔۔

اگلا قدم آگے کیا تو پاؤں ہوا میں معلق رہ گیا۔۔۔

پیروں کے نیچے سے زمین ختم ہو گئی۔۔۔۔

بس اب ایک قدم کی اور بات تھی اور وہ سمندر کی بے رحم موجوں کی نظر ہو جاتا۔۔۔

اس دنیا سے گم ہو جاتا۔۔۔

کبھی کسی کو یاد بھی نہ آتا۔۔۔۔

یہ موجیں کتنی ہی بے رحم کیوں نہ ہوتی۔۔۔

اسکی زندگی سے تو کم ہی ہوتیں۔۔۔۔

"رضا!۔۔۔۔" دور کہیں کسی نے پکارا تھا۔ اُسکا دوسرا قدم جو اٹھنے سے پہلے کانپ رہا تھا۔ وہ وہیں ٹھہر گیا۔ آواز دور تھی، غیر واضح سی۔

"رضا!۔۔۔" اب کہ سمندر کا شور بھی غائب ہو گیا، تمام آوازیں خاموش ہو گئیں، اُس لمحے میں اور کوئی آواز باقی نہ رہی۔ بس وہی پکار تھی۔ وہی نرم و مہربان پکار۔۔۔اُسکی ماں کی آواز۔

"رضا! سورۃ الشرح پڑھو۔" پس منظر میں یا شاید اُسکے لاشعور میں کہیں یہ آواز گونج رہی تھی۔

"سورہ الشرح پڑھو، اسے سمجھو۔ مایوسی تم پر ڈورے نہیں ڈالے گی۔" امی کہہ رہی تھیں۔ وہ اُسے مایوسی کے عالم میں سورۃ الشرح معہ ترجمہ پڑھاتی تھیں۔

کیا نہیں کھول دیا ہم نے، تمہارے لیے تمہارا سینہ ؟

اُسے یاد آیا کہ وہ اپنی کلاس کا ٹاپر تھا۔ جو شے سٹوڈنٹ سمجھنے میں کئی کئی دن لیتے تھے، وہ ایک لمحے میں سمجھ لیا کرتا تھا۔ وہ جو کام کرتا وہ بہترین انجام کو پہنچتا۔

اور ہم نے کم کر دیا تم سے، تمہارا بوجھ

اس نے ہوا میں معلق پاؤں پیچھے کیا، تو یاد آیا کہ جیل میں گزاری وہ رات جو اُس پر سب سے بھاری تھی، آج وہ کسی کو یاد نہ تھی۔ اسے خود بھی وہ رات بھول چکی تھی، بچوں نے اُس رات کا غم اُسے بھلا دیا تھا۔ اس نے دوسرا قدم بھی پیچھے کیا۔

وہ بوجھ کہ جس نے جھکا رکھی تھی تمہاری کمر

وہ دو قدم اور پیچھے ہوا، آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگے۔ وہ محلہ جہاں وہ بڑا ہوا، آج اس محلے میں جاتے نہ اسے کوئی خوف آتا تھا نہ شرمندگی ہوتی تھی، جبکہ کبھی وہاں سے گزرنے میں بھی اسکا سر جھکنے لگا۔

اور ہم نے تمہارے لیے بلند کیا، تمہارے ذکر کو

جامعہ کراچی میں ایک بار ایک مضمون پڑھانے کے بعد سے وہ مختلف نجی جامعات میں پڑھانے لگا تھا۔ وہ مزید قدم پیچھے ہونے لگا، سمندر بھی دور ہونے لگا۔ مختلف ایوارڈ وصول کرنے کے مناظر اُسکی آنکھوں کے سامنے آنے لگے، کبھی بیسٹ ٹیچر کا، کبھی بہترین اسکول چلانے کا، کبھی بچوں کی بہترین تربیت کرنے والے اسکول کا، تو کبھی بہترین کورس ڈیزائن کا۔ وہ مختلف سیمینار میں بطور مہمان بلایا جانے لگا۔ لوگ اُسکی عزت کرتے تھے، قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بھلا کیا کمی کی تھی اُسکے رب نے اسے؟ کیا کبھی ان میں سے کسی ایک نعمت کا بھی اُس نے شکر یہ ادا کیا تھا؟ قدم پیچھے سرکاتے وہ وہیں آرکا تھا، جہاں سے اب بس سمندر کی لہریں ہی نظر آرہی تھیں۔

پس بے شک! ساتھ ہے مشکل کے آسانی

آنسو اُسکی آنکھوں سے تواتر سے بہہ رہے تھے۔ وہ نشہ کرنے لگا تھا، سڑکوں پر رہنے لگا تھا، راستوں سے کچرا اور ردی چننے لگا تھا، سڑک سے کھانا اٹھا کر کھانے لگا تھا۔ لیکن یہ وقت اور بہت سے ایسے برے وقت گزر گئے تھے۔ گزرنے والے تمام برے وقت اُسکے لیے بہترین زندگی لائے تھے۔ اُسکے رب نے اسکے لیے دنیا کی نعمتیں کھول دی تھیں، اپنے خزانوں میں سے بے حساب دیا تھا۔ پھر کیوں وہ زمین اور زندگی خود پر تنگ سمجھتا تھا؟

بے شک! ساتھ ہے مشکل کے آسانی (سورۃ الشرح ۱-۶)

وہ گرنے کے سے انداز میں وہیں بیٹھ گیا۔ وہ پھر سے غلط قدم اٹھانے جا رہا تھا؟ وہ پھر سے اپنے رب سے مایوس کیسے ہو گیا تھا؟ کیا اسے اپنے رب پر بھروسہ نہیں تھا؟

اپنی پیاری وصابر ماں کا بیٹا۔۔۔

بھلا حرام موت کیسے مر سکتا تھا؟۔۔۔

----------+---------+--------

''میں یہاں بیٹھ جاؤں؟''سمندر کی تیز ہوا میں وہ قریب رکھی سنگی بینچ کے کنارے پر ٹیک لگائے، مٹّی پر بیٹھا ہوا تھا۔جب کسی نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُسے مخاطب کیا۔اُس نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک باریش بزرگ کھڑے تھے۔اِس لمحے اُسے کسی کی مداخلت پسند نہیں آرہی تھی، لیکن بزرگ کے چہرے پر چھایا نور اُسے جواب دینے پر مجبور کر رہا تھا۔

''جی!''اُس نے بس اثبات میں سر ہلا کر اجازت دی اور دوبارہ سامنے دیکھنے لگا۔

''بسم اللہ!''وہ برابر میں بیٹھے اور اُسے نظرانداز کیے،اپنے تھیلے نما بستے سے کوئی شے نکالنے لگے۔رضانہ چاہتے ہوئے بھی انہیں دیکھنے لگا۔

''آج خدا نے کھانے کو روٹی نصیب کی ہے۔''اُنہوں نے ایک نان نکال کر توڑتے ہوئے جانے خود سے کہا تھا یا اُس سے؟

''یہ لو، تم بھی کھاؤ۔''اُنہوں نے نان کا ٹکڑا اُسکی جانب بڑھایا اور مسکرائے۔

''میں نہیں کھانا چاہتا۔''اُس نے آہستگی سے کہا۔

''جانتا ہوں تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔لیکن میری طرف سے مہمان نوازی سمجھ لو۔''اتنی نرمی سے کہا کہ وہ بری طرح شرمندہ ہوا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔بس!اِس وقت طبیعت عجیب سی ہے۔''اُس نے وضاحت دی۔

''مسلمان اور کافر کے روزوں میں صرف سحری کا ہی فرق ہے۔ایسا میں نے نہیں، اللہ کے نبی ﷺ نے کہا ہے۔کھا لو، بنا سحری کے روزہ رکھنا مسلمان کا شیوہ نہیں ہے۔''اُنہوں نے کہا تو رضا نے روٹی کا ٹکڑا اتھام لیا۔وہ تو بھول ہی گیا تھا کہ سحری کا وقت ہے۔

''شاید آج آخری روزہ ہو۔آج آخری طاق رات ہے۔اللہ سے کچھ مانگنا نہیں چاہو گے؟''یکدم ہی انہوں نے پوچھا۔

''مانگنے لائق نہیں سمجھتا خود کو۔''اُس نے روٹی کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے بیساختہ ہی جواب دیا، تو وہ مسکرائے۔

''بھلا کون اِس دنیا میں مانگنے کے لائق ہے؟ پھر بھی مانگتے ہیں، کیوں کہ ہمارا دینے والا مانگنے سے خوش ہوتا ہے۔''انہوں نے کہا۔پھر پانی کی بوتل اُسکی جانب بڑھائی۔

''اذان ہونے والی ہے۔ پانی پی لو، اور وضو کر لو، میرے پاس زائد پانی ہے۔ پھر میں نماز پڑھاتا ہوں۔'' وہ کہہ کر کھڑے ہو گئے۔ رضا نے اُٹھ کر خاموشی سے وضو کیا، اتنی دیر میں اُنہوں نے اقامت کہی۔ اُنکی اقامت ہی اتنی خوش الحان تھی کہ اگر اذان دیتے تو نجانے کتنی مسحور کن ہوتی؟ وہ اُنکے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ نماز مکمل ہوئی تو بزرگ نے اُسے دیکھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اُنہوں نے رضا سے پوچھا۔

''میں بس! گھر چلوں گا۔ آپ کا بے حد شکریہ۔''

''کیا تم راستہ بھٹک گئے ہو؟'' اُنہوں نے پوچھا۔

''شاید!'' اُس نے عجیب سا جواب دیا۔

''چلے جانا گھر بھی۔۔۔ ابھی میرے ساتھ چلو۔ تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔'' انہوں نے اتنی اپنائیت سے کہا جیسے اُسے بہت پہلے سے جانتے ہوں۔

''پر میں آپکو نہیں جانتا۔'' وہ اب کہ پریشان ہوا۔

''ہمیشہ جاننا ضروری نہیں ہوتا، کیا یہ بے ضرر آدمی تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے؟'' انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا، اتنی خوبصورت مسکراہٹ اُس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے، پر میں کافی دیر ہوئی، گھر سے دور ہوں۔ گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' اُس نے ذرا آہستہ سے وضاحت دی، وہ برا نہ مان جائیں اس بات کا ڈر بھی تھا۔

''کچھ دیر کے لیے آ جاؤ۔ میں تمہیں کسی سے ملوانا چاہتا ہوں۔'' وہ کہہ کر اُسکا جواب سننے کے لئے رکے نہیں، بلکہ آگے بڑھ گئے اور رضا کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں اُنکے پیچھے چلنے لگا۔ نجانے وہ اُسے کہاں لیکر جا رہے تھے؟ اور نجانے وہ کیوں اُنکے پیچھے چل رہا تھا؟ وہ راستے بھر نعتیہ اشعار پڑھتے رہے۔ اور رضا مسحور سا، اُنہیں سنتا اُنکے پیچھے پیچھے چلتا رہا یہاں تک کہ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہو گیا اور وہ اُسے ایک بستی میں لے آئے۔

---------+---------+--------

وہ سڑکوں پر جھاڑو دینے والا سرکاری ملازم تھا۔ کافی دیر ہوئی، وہ غور سے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ ریسکیو ٹیمیں چاروں جانب پھیلی ہوئی تھیں۔ غوطہ خور ناکام واپس لوٹ آئے تھے۔ صبح کے بعد سے اب اِس جگہ پر فلحال عوام کو داخلے سے روکنے کے لیے، **ڈونٹ کراس** کا پیلا ٹیپ لگا دیا گیا تھا۔ اُسکے پیچھے ہی رضا کی متعدد تصاویر لگی تھیں، جنکے نیچے ''مسنگ''(گمشدہ) کا لفظ جلی حرفوں میں لکھا تھا۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ لوگ یہیں تھے۔

''تم لوگوں کو گھر جانا چاہیے، کوئی بھی پیش رفت ہو گی تو میں پہلے تم سب کو ہی بتاؤں گا۔'' نوید انہیں پچھلے کئی گھنٹوں میں کئی مرتبہ گھر واپس جانے کا کہہ چکا تھا پر کوئی بھی وہاں سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ افطار ہونے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے باقی تھے۔

''کچھ تو معلوم ہو جائے رضا کے بارے میں، کوئی تسلی ہو جائے تب ہی واپس جا سکتے ہیں ہم!'' مقدّم نے جواب دیا تھا۔

''مقدم! مجھے حسین ٹھیک نہیں لگ رہا۔ کم از کم اُسکا ہی سوچ لو۔'' نوید نے حسین کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے اُسے کہا۔ مقدّم نے بھی چہرہ موڑ کر چٹان کا سہارا لیے کھڑے حسین کو دیکھا، اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ وہ سب کچھ بتا دینے کے بعد اتنا زیادہ خاموش تھا کہ اُس پر قوت گویائی سے محروم ہونے کا گمان ہونے لگا تھا۔ کتنی ہی دیر سے وہ چپ چاپ کھڑا ایک ٹک سمندر کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ چپ تھا تو اب دنیا قبرستان لگ رہی تھی، اُسے خاموش نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کم از کم حسین کو نہیں۔۔۔

''وہ میری بات نہیں مانے گا۔ لیکن چلو! میں کوشش کرتا ہوں۔'' اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ اِس سے پہلے کہ نوید کوئی جواب دیتا، میٹروپولیٹن کارپوریشن کا لباس پہنے وہ شخص جس نے ہاتھوں میں جھاڑو پکڑ رکھی تھی، رضا کی تصویر والے پوسٹر کے قریب ہوا۔ اُسکے چہرے پر سوچ کے جالے بچھے تھے۔ وہ رضا کی تصویر کو بغور دیکھ رہا تھا کہ مقدم سے بات کرتے نوید کی نظریں اُس پر پڑیں۔

''کیا کام ہے؟ عوام کا داخلہ ممنوع ہے اِس طرف۔'' نوید نے اُسے آواز دی تو مقدم نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ وہ ٹیپ کو پار کر کے اِس طرف آیا تھا۔

''آپ اس آدمی کو ڈھونڈ رہے ہیں؟'' اُس نے نوید کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! تمہیں کیا کام ہے؟''اُس نے ضبط سے پوچھا۔

''کیا ہوا اسے؟''اُس نے پھر رضا کی تصویر کی جانب دیکھا۔اب کہ نوید کو غصّہ آیا۔

''اِس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی ہے۔ہم اس لیے تلاش کر رہے ہیں اسے۔۔۔''نوید کے کچھ بھی بولنے سے پہلے مقدم نے سنجیدگی سے جواب دیا، وہ نوید کے چہرے پر ناگواری دیکھ چکا تھا۔

''کیا کل رات کو؟یہی کوئی ڈیڑھ دو بجے کے قریب؟''اُس ملازم کا سوال بڑا ہی غیر متوقع تھا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟''کافی دیر سے خاموش عمر بھی سیدھا ہوا۔علی اور حسین نے بھی پلٹ کر اُسے دیکھا۔

''ارے! میں یہیں پر تھا۔کل میری رات کو کچرا اٹھانے کی ڈیوٹی تھی، میں ساحل سے کوڑا سمیٹ کر واپس آ رہا تھا تو۔۔۔''

''سیدھے سیدھے بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا؟''نوید کا ضبط جواب دے گیا۔

''وہی تو بتا رہا ہوں۔''وہ ناراض ہوا۔

''اُس نے چھلانگ لگا دی تو تم نے کچھ کیا نہیں؟ کیا روکا بھی نہیں اُسے؟ کسی کو مدد کے لیے بھی نہیں بلایا؟''حسین کی برداشت اب جواب دے رہی تھی۔اُس نے درشتی سے پوچھا تھا۔

''ارے بھائی! مجھے بتانے تو دو،اِس نے چھلانگ نہیں لگائی۔میں وہیں تھا۔''اُس نے بیزاری سے کہا۔لیکن اُسے نہیں معلوم تھا کہ اُس نے وہاں کھڑے ہر انسان کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

''وہ سمندر میں نہیں کودا تھا؟ کیا تم نے واضح دیکھا؟ وہ یہی آدمی تھا؟''علی نے اتنی دیر میں پہلی بار پوچھا تھا۔

''ہاں! ہاں! وہ یہی تھا۔سمندر کے کنارے کھڑا تھا،اتنے کنارے کے مجھے لگا کہ اب کود جائے گا۔لیکن پھر خود ہی پیچھے ہٹ گیا اور دور جا کر بیٹھ گیا۔میں وہیں کھڑا رہا تا کہ اگر وہ دوبارہ ایسی کوئی کوشش کرے تو میں اُسے روک سکوں۔لیکن پھر کوئی بوڑھا باریش آدمی اُسکے پاس آیا، کچھ دیر اُسکے ساتھ بیٹھا رہا۔پھر دونوں نے فجر کی نماز پڑھی اور وہ آدمی اُسے اپنے ساتھ کہیں لے گیا۔بس! اتنا ہی معلوم ہے مجھے۔لیکن اِس نے چھلانگ نہیں لگائی ہے۔''کوئی پہاڑ تھا جو سینے سے سرکا تھا۔

''مجھے بتاؤ وہ لوگ کہاں اور کس طرف گئے تھے؟'' نوید نے اب کہ ذرا آہستہ مگر سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''میرے خیال سے وہ لوگ یہاں سے مزید آگے کی طرف گئے تھے۔ساحل کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔مزید میں اور کچھ نہیں جانتا۔'' اُس نے کہا۔

''دیکھو! ہم کل سے بہت پریشان تھے۔اگر ہماری بات بری لگی ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔تمہارا شکریہ، تم نے بہت مدد کی ہے ہماری!'' نوید نے اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں بھائی! میں سمجھ سکتا ہوں۔'' اُس نے خوش دلی سے کہا۔

''شیراز!'' نوید نے دور کھڑے شیراز کو آواز دی۔

''جی سر!'' اُس نے وہیں سے پوچھا۔

''ریسکیو ٹیم کو لیکر میرے پیچھے آؤ! ہم آگے جا رہے ہیں۔'' نوید نے کہا اور پھر باقی سب کی طرف مڑا۔

''تم لوگ میرے ساتھ آؤ! اُمید ہے رضا مل جائے۔'' وہ اُن سے کہتے ہوئے موبائل کی جانب دیکھتے گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

جزا کا کوئی میسج نہیں آیا تھا، نوید نے اُسے کہا ہوا تھا کہ اگر رضا گھر آ جائے تو وہ نوید کو اطلاع دے دے۔یعنی وہ ابھی تک گھر بھی نہیں آیا تھا۔

----------+---------+--------

''کیا تم تھک گئے ہو؟'' بستی کے داخلی دروازے پر رک کر اُنہوں نے رضا کو دیکھا تو اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

''معاف کرنا، اس بوڑھے نے تمہیں اتنا چلایا۔'' عجیب ہی انسان تھے، بات بات پر مسکراتے تھے۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔بلکہ مجھے اچھا محسوس ہو رہا ہے۔'' اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

''آؤ!''اُنہوں نے ایک گھر کے دروازے کی جانب اشارہ کیااور اسے اندر آنے کی دعوت دی، وہ خاموشی سے اندر آگیا۔ کسی گاؤں کے کچے مکان جیسا یہ گھر نا معلوم کس کا تھا؟ رضا نے اُنکی دیکھادیکھی چپل باہر اُتاری، اور اندر آیا۔ مکان کچا ہونے کے باوجود اندر سے سادگی مگر خوبصورتی سے سجا تھا۔ یقیناً سجانے والے کا کمال تھا۔

''بیٹی! کیا سمیر اندر ہے؟''انہوں نے کمرے کے اندر بنے دوسرے دروازے کے پردے کے پاس کھڑے ہو کر آواز دی۔

''جی ابّو!''پردے کے پیچھے سے زنانہ آواز سنائی دی۔

''میرے ساتھ ایک مہمان ہیں، اُس سے ملنے آئے ہیں۔''اُنہوں نے کہا۔

''ٹھیک ہے ابّو! آپ انہیں پانچ منٹ بعد اندر لا سکتے ہیں۔''اندر سے جواب آیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے اُسکے پاس آئے۔

''یہ میری بیوہ بیٹی کا گھر ہے۔ اُسکا بیٹا اور میرا نواسہ سمیر، اُسے لوگوں سے ملنا بہت پسند ہے۔ پر لوگ اُس سے ملنا نہیں چاہتے۔ اِس لیے میں نے سوچا کہ تم اِس سے مل لو۔''اُنہوں نے رضا کے پاس آتے ہوئے کہا۔

''لوگ ملنا نہیں چاہتے؟ پر کیوں؟''اسے حیرت ہوئی۔

''اندر آجاؤ!''اُنہوں نے جواب دینے کے بجائے کمرے کا پردہ ہٹایا اور اُسے اندر لے آئے۔ رضا اندر آیا اور اُسے لگا جیسے کسی نے اسکا دل مُٹھی میں جکڑا ہو۔ وہاں ایک چار سے پانچ سال کا بچہ بستر پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا، ناک میں آکسیجن کی پائپ لگی تھی، جبکہ ہاتھوں میں مختلف نوعیت کی ڈرپس وغیرہ۔ وہ کمزور اور لاغر سا بچہ اپنے بازوؤں میں ایک ننھا سا بھالو پکڑے ہوئے تھا۔

''سمیر! دیکھو تو ذرا، مہمان آئے ہیں۔''انہوں نے بھالو سے کھیلتے سمیر کو مخاطب کیا تو اُس نے رک کر بڑی بڑی معصوم آنکھوں سے رضا کو دیکھا۔ پھر اُسکے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''دوست؟''اُس نے اپنے نانا سے پوچھا۔

''آپ انہیں دوست بنا سکتے ہیں۔''نانا نے پیار سے کہا تو وہ ہنسا، پھر رضا کو دیکھا اور زبان نکال کر شرارتی انداز میں اُسکا منہ چڑھایا۔ رضا بیساختہ مسکرایا تھا، یکدم ہی اُسکا دل اِس بچے کی محبت سے لبالب بھرنے لگا۔ وہ اُسکے قریب آیا، اور باوجود ڈرپ کے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔

''تم کتنے پیارے ہو؟اور کتنا پیارا نام ہے تمہارا۔'' رضا نے کہا۔

''اُسے ہیپاٹائیٹس سی ہے،اسکا جگر خراب ہو چکا ہے۔لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بیماری پھیلنے والی ہے۔اپنے بچوں کو اِسکے ساتھ کھیلنے نہیں دیتے، ملنے بھی نہیں دیتے۔اِسکو سارا دن اسی کمرے میں گزارنا پڑتا ہے۔'' انہوں نے بتایا تو اُسکا دل کٹا۔پتہ نہیں اللہ نے اُسکے دل میں بچوں کے لیے اتنی محبت کیوں رکھی تھی؟اُسکی تکلیف رضا کو اپنے دل پر محسوس ہونے لگی۔

''آپ میرے ساتھ کھیلیں گے؟'' اُس نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہاں!کیوں نہیں؟کیا کھیلنا چاہو گے تم؟'' رضا نے پوچھا۔

''میں لوڈو کھیلوں گا نانا!'' اُس نے اپنے نانا کو مخاطب کیا۔

''لوڈو ہے تمہارے پاس؟'' رضا نے پوچھا۔

''ہاں!اِسکی ماں،اِسکی خوشی کی خاطر سارے کھلونے لا کر رکھتی ہے۔پر کوئی ہے نہیں اِسکے ساتھ کھیلنے والا۔'' انہوں نے بتایا۔

''میں کھیلوں گا ناں تمہارے ساتھ۔'' اُس نے بچے کو بستر پر بٹھایا اور خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''پر مجھے نہیں آتا۔'' اُس نے پریشانی سے بتایا۔

''کوئی بات نہیں، میں سکھا دوں گا۔'' اُس نے پیار سے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔شاید خوشی سے۔۔۔

اُسکے نانا اُسکا لوڈو لے آئے۔رضا اُسکے ساتھ بیٹھ کر اُسے کھیلنے کا طریقہ سکھانے لگا۔درمیان میں وہ اِس بچے کا جوش اور خوشی دیکھتا تو آنکھوں میں آنسو اُمڈنے لگتے۔لوگ کیوں کرتے ہیں بچوں کے ساتھ ایسا؟وہ بیمار تھا تو اُس میں اُسکا قصور تو نہ تھا۔

اسے یکدم ہی اپنے بچے یاد آئے۔وہ بھی تو کل سے کتنے پریشان ہوں گے؟یکدم ہی اپنے کیے پر پچھتاوا ہونے لگا۔دل کیا اُڑ کر واپس چلا جائے۔وہ تو چاہتا تھا کہ ایک ایسی دنیا ہو جہاں صرف وہ ہو،اور بچے ہوں۔جہاں کوئی بیماری ہو،نہ غم،نہ دکھ اور نہ انہیں کوئی نقصان پہنچانے والا۔آہ!وہ کیا کرنے جا رہا تھا؟

--------+---------+----------

کتنے گھنٹے گزر چکے تھے ؟ معلوم نہیں ! معلوم تھا تو بس یہ کہ رضا اب تک گھر واپس نہیں آیا تھا۔ بچے الگ پریشان تھے۔ رات بھر رو رو کر دعا کرتے رہے تھے۔ جزا کچھ دیر کے لیے گھر گئی تھی، لیکن پھر دل گھبرانے لگا تو پناہ گاہ واپس آ گئی۔ بچوں کا مرجھایا چہرہ دیکھ کر اُسے دکھ ہونے لگا تھا، لیکن اِس وقت اُسکے اپنے پاس تسلی کے لیے الفاظ نہ تھے۔

وہ ہر آہٹ پر چونکتی کہ شاید رضا واپس آ گیا ہو، ہر بار فون کی گھنٹی پر بے قرار ہو کر دیکھتی کہ شاید نوید کی طرف سے اُسکی خیریت کی اطلاع آئی ہو۔ بار بار رضا کے نمبر پر فون کرتی لیکن ہر بار **نمبر بند ہے** کی آواز سنائی دیتی۔

عائشہ جی الگ جائے نماز پر بیٹھی کل سے اُسکی واپسی کی دعائیں کر رہی تھیں۔ وہ رو رہی تھیں۔ پر وہ کیسے روتی؟ کس حق سے ؟ فقط ایک شخص کا جانا سارے گھر کو موت جیسی خاموشی میں مبتلا کر گیا تھا۔

میں دوبارہ واپس نہ آؤں کبھی تو۔۔۔ تو میرے بچوں کا خیال رکھنا۔

یہ بھی اُسی کے آخری الفاظ تھے کہ وہ چاہ کر بھی یہاں سے واپس نہیں جا رہی تھی۔

''آہ رضا ! کاش کہ تم کچھ دیر مجھے بھی سن لیتے، کاش ! کہ مجھے ہی بتا دیتے۔'' اُس نے دکھ سے کہا۔ پر اب کوئی فائدہ نہ تھا، وہ کہیں نہیں تھا۔ کہیں بھی نہیں۔۔۔۔

----------+---------+--------

سمیر کھیلتے کھیلتے تھک گیا، پر رضا نہ تھکا نہ اُسکے ماتھے پر شکن آئی۔ یہاں تک کہ سمیر تھک کر سو گیا۔ جس وقت وہ سویا اُس وقت ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔

''رمضان نہ ہوتا تو تمہارے لیے ظہرانے کا انتظام کرتا۔'' انہوں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں ! بس اب میں چلوں گا۔''

''نماز نہیں پڑھو گے؟''اُنہوں نے پوچھا تو وہ انکار نہ کر سکا۔خاموشی سے جا کر وضو کیا اور انکے پیچھے نماز ادا کی۔نماز کے بعد وہ تلاوت کرنے لگے۔اُنکی تلاوت اتنی خوبصورت تھی کہ وہ بیٹھا سنتا رہا۔۔۔سنتا رہا۔۔۔یہاں تک کہ جب تلاوت ختم ہوئی تو وہ جیسے ہوش میں آیا۔

''کافی دیر ہو گئی ہے۔مجھے اب چلنا چاہیے۔''وہ اب حقیقتاً پریشان ہونے لگا تھا۔

''چلے جانا، چلے جانا۔''بزرگ نے قرآن پاک کو جزدان میں رکھتے ہوئے کہا۔''لیکن پہلے یہ بتاؤ،''اُنہوں نے رک کر رضا کو دیکھا۔''یہ زندگی کیا تمہاری ہے، جو اسے ختم کرنے چلے تھے رضا؟''اور اُس لمحے۔۔۔اُس وقت۔۔۔۔وہ ساکت رہ گیا۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ زندگی دینا اور زندگی لینا، دونوں اللہ کے اختیار میں ہے؟ کیا تم اللہ کے اختیار میں مداخلت کرنے جا رہے تھے؟''وہ سوال جتنی نرمی سے پوچھا گیا تھا، اتنی ہی بری طرح اُسکے رونگھٹے کھڑے ہوئے تھے۔وہ بس ساکت آنکھوں سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

''جب ہم ناحق کسی کی جان لینے کی، یا اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو در حقیقت ہم وہ دعویٰ کرتے ہیں، جو نمرود نے کیا تھا۔ وہ بھی تو یہی کہتا تھا کہ میں زندہ کرتا ہوں اور میں ہی مارتا ہوں۔ہم کون ہوتے ہیں مارنے والے؟ چاہے خود کو یا چاہے کسی اور کو۔''وہ ٹھہرے، پر وہ ایسے ہی بیٹھا رہا۔

''میں۔۔۔میں بس۔۔۔۔بھٹک گیا تھا۔''اُس نے شرمندگی سے سر جھکایا۔

''انسان ہی بھٹکتے ہیں، پر جو سر جھکا دے وہ انسان ہے، جو اکڑ جائے وہ شیطان۔جو تکلیفیں زندگی میں آتی ہیں۔وہ اللہ کی طرف سے ہیں۔ ہمیں اسی کے ساتھ جینا ہے۔ورنہ خودکشی حرام کیوں ہوتی؟''اُنکے کسی سوال کا جواب اُسکے پاس نہیں تھا۔

''آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟''اُس نے پوچھا۔

''ہر سوال کا جواب نہیں ہوتا۔''دروازے پر دستک ہوئی تو وہ کھڑے ہو گئے۔پھر پردے کے پاس گئے، وہاں یقیناً اُنکی بیٹی تھی، جس نے ہاتھ بڑھا کر ایک کپڑے میں لپٹا سامان انکو دیا، وہ اُسے لیے رضا کے پاس آئے۔وہ کھڑا ہو گیا۔

''تمہارا سفر لمبا ہے، راستے میں روزہ کھولنے کے لئے یہ میری طرف سے قبول کرو۔''اُنہوں نے ایک چھوٹا سا تھیلا اُسکی طرف بڑھا دیا۔

وہ شرمندہ ہوا۔

''آپکو بہت زحمت ہوئی۔ میں سمیر کے لیے۔۔۔''اُس نے کہتے ہوئے جیبوں میں ہاتھ ڈالے تاکہ اُنکی کچھ امداد کر سکے، لیکن یاد آیا کہ وہ اپنا موبائل وغیرہ کہیں پھینک آیا ہے۔اپنی حرکت پر اسے جی بھر کر افسوس ہوا۔

''جو اللہ سے لیتا ہے، وہ بندوں کا محتاج نہیں ہوتا۔''اُسے شرمندہ دیکھ کر انھوں نے کہا۔

''میں سمیر کے لیے کچھ تحفتاً دینا چاہتا تھا۔''اُس نے شرمندہ سے لہجے میں وضاحت دی۔

''تم نے سمیر کو اپنا وقت دیا ہے۔یہی سب سے بڑا تحفہ ہے اُسکے لیے۔''اُنہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں پھر آؤں گا۔''اُس نے انکا ہاتھ تھام کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''ان شاءاللہ!''اُنہوں نے بس اتنا ہی کہا۔ پھر رضا انہیں خدا حافظ کہہ کر پیدل ہی گھر کے راستے پر نکل پڑا۔اُسکے پاس گاڑی نہیں تھی، کوئی موبائل بھی نہ تھا۔سوچا تھا راستے سے کسی سے مدد لے لے گا۔پر فلحال تو کوئی آدم نہ آدم زاد نظر آرہا تھا۔

''میں نے بزرگ کا نام تو پوچھا ہی نہیں؟''یکدم ہی اُسے یاد آیا تو تیزی سے واپس اسی راستے پر پلٹا جہاں انکا گھر تھا، لیکن وہ بستی کا راستہ بھٹک گیا۔وہ بار بار کوشش کرتا لیکن ہر بار مرکزی شاہراہِ پر آجاتا۔پر اسے بستی کا راستہ دوبارہ نہ مل سکا۔بلآخر تھک کر وہ شاہراہِ کے کنارے پر چلنے لگا۔اُسکا راستہ واقعی لمبا تھا۔اُسے کم از کم اُس جگہ تک تو پہنچنا تھا، جہاں اُسے کوئی انسان نظر آجاتا، تو وہ کوئی ٹیکسی کر لیتا، یا لفٹ لے لیتا۔لیکن فلحال تو کسی ذی روح کے آثار نہ تھے۔روزے کی وجہ سے اُسکی طبیعت بھی خراب ہونے لگی تھی۔بلآخر جب وہ آبادی کے قریب پہنچا تو مغرب کا وقت شروع ہو چکا تھا۔

''کیا قسمت ہے!جب آبادی میں پہنچا ہوں تو افطار کا وقت شروع ہو گیا ہے۔''اُس نے سوچا اور سڑک کے برابر بنے فٹ پاتھ پر آیا، جہاں لوہے کی ریلنگ کے پیچھے سمندر تھا،اور ریلنگ کے اِس طرف بینچ رکھی تھی۔اُس نے ہاتھ میں پکڑا کھانا بینچ پر رکھا اور اسے کھولا، اندر ساگ اور روٹی تھی۔پانی کی ایک بوتل بھی بزرگ نے ہی اُسے دی تھی۔وہ کھانا سامنے رکھے اذان کا انتظار کر رہا تھا۔

''باجی ! افطاری دے دو۔۔۔افطاری دے دو۔۔۔اے بھائی ! افطاری دے دو۔۔۔'' وہ بینچ پر بیٹھا اذان کا منتظر تھا کہ تب ہی دس سے بارہ غریب بچوں کا ٹولہ آوازیں لگاتا اُسی طرف آنے لگا۔ اُنکے کپڑے میلے تھے، وہ چھوٹے بڑے ہر عمر کے تھے۔ کسی نے کندھوں پر تھیلا لٹکار کھا تھا، تو کوئی خالی ہاتھ تھا۔ اِس لمحے جب سب، اپنے گھروں میں ہوتے ہیں، وہ رضا کو باہر بیٹھا دیکھا کر اُسکے پاس آ گئے۔

''بھائی ! افطاری دے دو !'' اُن میں سے نسبتاً سب سے چھوٹے بچے نے اُس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اُسے دیکھ کر مسکرایا۔

''میرے پاس بہت زیادہ تو نہیں ہے، پر آؤ ہم سب مل کر کھاتے ہیں۔'' اُس نے تمام بچوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس سموسے ہیں، وہ پیچھے والی ایک آنٹی نے دیے تھے۔'' ایک بلوچی لباس پہنی، سر پر اپنے قد سے لمبی چادر ڈالی معصوم سی بچی بولی۔

''اور میرے پاس حلوہ ہے۔ میری ایک باجی نے دیا مجھے۔''

''جسکے پاس جو بھی ہے وہ یہاں رکھ دے ہم مل کر افطاری کریں گے۔'' اُس نے کہا تو بچے خوش ہو گئے۔

--------+---------+----------

اذان ہو چکی تھی، اُنہوں نے راستے میں سوائے پانی کے اور کسی شے سے روزہ افطار نہ کیا تھا۔ عید کا چاند نکلا یا نہیں اسکی بھی کچھ خبر نہ تھی۔ نوید گاڑی چلا رہا تھا، حسین اُسکے برابر میں سڑکوں پر متلاشی نظروں سے صرف رضا کو ڈھونڈ رہا تھا، پیچھے عمر بیٹھا تھا، گاڑی اُسکی تھی پر چلا نوید رہا تھا۔ مقدم اور علی پیچھے والی گاڑی میں ساتھ آ رہے تھے۔ اُن کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔

''کیا وہ گھر نہیں آیا اب تک ؟'' عمر نے پر امید لہجے میں پوچھا۔

''نہیں ! گھر سے کوئی اطلاع نہیں آئی ہے۔'' بیک ویو مرر میں دیکھتے نوید نے جواب دیا۔

''کس کے ساتھ چلا گیا ہے ؟ کیوں کر رہا ہے ایسا ؟'' وہ دکھ کی کیفیت میں بولا۔

''وہ ہم سب سے دور رہنا چاہتا ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن اُسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' پیسنجر سیٹ پر بیٹھے حسین نے جواب دیا تھا، پھر یکدم ہی وہ سیدھا ہوا، اور آنکھیں چھوٹی کر کے سامنے سڑک کی جانب دیکھا۔

''کیاہوا حسین؟''نوید نے اُسکی نظروں کے تعاقب میں دیکھا، تو دور ایک بینچ پر بہت سارے بچے نظر آئے۔

''و۔۔۔وہ۔۔۔۔وہ رضا ہے ناں؟ہاں؟''وہ یکدم ہی چیخا تو دونوں ہی چوکس ہوئے۔

''کہاں پر حُسین؟مجھے تو صرف بچے دکھائی دے رہے ہیں؟''نوید کو سمجھ نہیں آیا۔وہ جس بینچ کی جانب اشارہ کر رہا تھا وہ اُن سے کافی دور تھی، اور ٹھیک سے نظر بھی نہیں آرہی تھی۔اوپر سے مغرب کی اذان ہوئے آدھے گھنٹے سے اوپر ہو چکا تھا لہٰذا روشنی بھی اب ہلکی ہلکی باقی رہ گئی تھی۔

''وہ رضا ہے، میں نے بچوں کے ساتھ ہی اسکی جھلک دیکھی ہے۔ابھی شاید نظر نہیں آرہا۔ ''حسین بے چین ہوا تو نوید نے گاڑی کی رفتار تیز کی تاکہ جلد از جلد وہاں پہنچ سکے۔

''یہ میرا دوست ہے، لیکن مجھے بہت تنگ کرتا ہے۔''بینچ پر بیٹھا رضا اُن ننھے بچوں کی باتیں سن رہا تھا۔کچھ افطار کر چکے تھے، کچھ ابھی بھی کر رہے تھے۔رضا نے چند لقموں کے علاوہ کچھ نہ لیا۔باقی سب بچوں کو ہی دے دیا تھا۔

''کیوں تنگ کرتے ہو بھئی اِسکو؟''رضا نے مصنوئی غصّے سے دوسرے بچے کی طرف دیکھا۔

''دوست ہے ناں میرا۔۔۔اسکو تنگ نہیں کروں گا تو کس کو کروں گا؟''اُس نے جواب دیا تو سارے بچے ہنسنے لگے۔ایسے ہی۔۔۔۔بلا وجہ ۔۔۔۔رضا اُنکی معصوم ہنسی پر مسکرایا۔

''آپکی انگوٹھی کتنی پیاری ہے؟''ایک چھوٹے سے بچے نے جو اسکے پیروں کے ساتھ چپک کر کھڑا تھا، اُس نے گھٹنوں پر رکھا رضا کا ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔اُسکی عقیق کے پتھر جڑی انگوٹھی اُسے بہت پسند آئی تھی۔

''تمہیں چاہیے؟''رضا نے اُس سے پوچھا۔قریب کوئی گاڑی آکر رکی تھی، پر اُس نے دھیان نہ دیا۔

''نہیں! یہ تو اتنی بڑی ہے۔''اُس نے اپنی معصوم آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

گاڑی کا دروازہ کھلا اور حسین اُس میں سے اُترا۔۔۔سب سے پہلے وہی اُترا۔۔۔ اور سامنے بیٹھے سانولی رنگت والے پر کشش مرد کو دیکھ کر جیسے کوئی رکی سانس بحال ہوئی تھی۔

''توجب بڑے ہو جاؤ تو تب پہن لینا۔'' رضا نے ہنستے ہوئے اپنی انگوٹھی اُتاری، بچے اشتیاق سے اُسے دیکھنے لگے۔

گاڑی سے باقی لوگ بھی اُتر گئے۔ اور اس کو صحیح سلامت دیکھ کر سب ہی کی سانسیں بحال ہوئی تھیں۔ وہ آج بھی بچوں میں گھرا تھا، پتہ نہیں کیسے؟ پر بچے اُسکے پاس بھنوروں کی طرح جمع ہو جاتے تھے۔ وہ محبت بانٹنا جانتا تھا۔ اور وہ محبت کے بھوکے ہوتے تھے۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے اُسے ہی دیکھ رہے تھے، اور وہ ارد گرد سے بے نیاز اپنے ننھے دوستوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

''لاؤ! ہاتھ دو اپنا۔'' رضا نے اُس بچے کا ہاتھ تھاما پھر اسکی ننھی سی انگلی میں وہ انگوٹھی پہنا دی۔ اسکے چھوٹے سے ہاتھ پر وہ بڑی سی انگوٹھی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ بچے ہنسنے لگے۔ رضاالٰہی ہو اور اسکے ارد گرد بچے ہنستے نہ ہوں۔۔۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

''رضا!۔۔۔'' کسی نے زور سے پُکارا تھا۔ اِس پکار میں زمانوں کی تڑپ تھی، دکھ تھا، پچھتاوے تھے، وہ پہچان گیا۔ اِس ایک آواز کو وہ ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا، پلٹ کر دیکھا تو آنکھوں کو یقین نہ آیا۔ وہ سارے آئے تھے۔۔۔ سب کے سب۔۔۔ اُسکے لیے۔ وہ حیران سا کھڑا ہوا۔

کل سے اب تک اُس نے صرف ایک ہی بات سوچی تھی، کہ بچے گھر میں پریشان ہو رہے ہوں گے۔ عائشہ جی پریشان ہو نگی۔ پر اِن سب میں اُس نے اپنے دوستوں کو تو سوچا ہی نہ تھا۔ اُس نے تو سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اُسکے لیے پریشان ہوں گے۔ اُسے ڈھونڈ رہے ہونگے بلکہ ڈھونڈ ہی نکالیں گے۔

جب یاد کا قصّہ کھولوں تو کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

میں گزرے پل جو سوچوں تو کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

وہ حسین کو گاڑی کا دروازہ کھلا چھوڑتے اپنی طرف تیزی سے آتے دیکھ رہا تھا۔ اُسکے قدم تیز تھے، پر اس لمحے رضاالٰہی کی دنیا رک رک کر چلنے لگی۔۔۔ آہستہ آہستہ۔۔۔ کسی سلو موشن سین کی طرح۔۔۔

اُس رات بھی تو وہ غائب ہو گیا تھا۔ اُس رات بھی تو وہ خود کو تباہ کرنے نکلا تھا۔ اُس رات اُسکے دوست پریشان کیوں نہ ہوئے؟ اُس رات کوئی کیوں نہ آیا؟ دس سال قبل وہ لوگ اُسے ڈھونڈ لیتے تو شاید وہ اتنے پچھتاوے لیے نہ کھڑا ہوتا۔

اب جانے کس نگری میں آباد ہیں جاکر مدتوں سے

میں رات گئے تک جاگوں تو، کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

حسین اُسکے پاس آکر رکا نہ تھا، نہ اسے دیکھا، نہ کوئی سوال کیا۔ بس سیدھا اُسکے گلے لگ گیا۔ رضا ایک قدم پیچھے ہوا پر حسین کی گرفت مضبوط تھی، ایسے جیسے اُس نے آج رضا کو چھوڑ دیا تو وہ ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ باقی چاروں میں سے کوئی آگے نہ بڑھا، یا شاید اُنکی ہمت ہی نہ ہوئی۔

کچھ باتیں تھیں پھولوں جیسی، کچھ لہجے خوشبو جیسے تھے۔

میں تنہا چمن میں ٹہلوں جو تو، کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

رضا نے ایک بات جو خود سے بھی چھپا کر رکھی تھی وہ ایک بات اُسے آج سمجھ آگئی۔ وہ یہ کہ دس سال پہلے بھی اُسے اپنے دوستوں کا انتظار تھا۔ اسے اُمید تھی کہ شاید وہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے پہنچ جائیں گے کہ رشتوں کے نام پر بس! دوستی ہی مخلص لگنے لگی تھی اُسے۔۔۔

اور آج اُسے ایک بار پھر دوستی مخلص لگی تھی۔ آج ان سب کو خود کے لئے پریشان دیکھ کر یقین آیا تھا کہ کسی کو اسکے نہ ہونے سے بھی پریشانی ہو سکتی ہے۔ اسے صحیح سلامت دیکھ کر کسی کو سکون آتا ہے۔ اُس نے اپنے بازو اٹھائے اور حسین کے گرد پھیلاتے اسے تھام لیا، آج اُس نے دوستی کا ہاتھ نہیں ٹھکرایا۔ پھر اسی کے کندھوں پر سر رکھ کر وہ رو دیا۔

وہ پل بھر کی ناراضگیاں، اور مان بھی جانا پل بھر میں

اب خود سے جب بھی روٹھوں تو، کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں

غم بہت سارے تھے، ماں کا، باپ کا، ماموں کا، ہر شے کا۔۔۔ اتنے غم آج ایک ساتھ نکل گئے تھے۔ وہ روتے روتے زمین پر بیٹھا، حسین اُسکے ساتھ بیٹھ گیا۔ باقی چاروں جو سن سے کھڑے بس آگے بڑھنے کی ہمت کر رہے تھے، اُسے ہچکیوں سے روتا دیکھ کر وہ ہمت بھی جانے لگی۔ وہ یونیورسٹی کے زمانے کا حالات سے ستایا لڑکا، جسکو وہ کرید کرید کر تھک گئے کہ شاید اب وہ کچھ کہہ دے۔ اُس لڑکے نے آج اپنا خول توڑ دیا تھا۔

سولہ سال لگے انہیں اُسکا بھروسہ جیتنے میں۔۔۔۔

سولہ سال۔۔۔۔۔

سولہ سال بعد یہ چھپن چھپائی کا کھیل ختم ہوا تھا۔۔۔۔

اور اُس نے جان لیا کہ سامنے کھڑے ان پانچوں سے چھپنے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ اُسکے دوست تھے، اُن سے بھلا کیا چھپنا؟ حسین نے اسے اب بھی نہیں چھوڑا، آج وہ اُسے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ایک بار وہ یہ غلطی کر چکا تھا پر آج نہیں۔۔۔

علی جو پچھلے کئی گھنٹوں سے خاموش تھا، وہ بس اُن دونوں کو دیکھ رہا تھا، لیکن منظر بار بار دھندلا رہا تھا۔ وہی تو تھا اِن سب کا ذمہ دار، اُسکی ایک ضد نے سب کو اس نہج پر لایا تھا۔ کم از کم اسکو تو اپنا آپ ہی ذمہ دار لگتا تھا۔ اُس نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔

وہ جو کبھی برا نہیں مانتے تھے، کسی بات کا بھی نہیں۔۔۔۔ وہ کیسے اتنا ناراض ہو گئے کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ یہ کیسا قطع تعلق تھا؟ جس نے ایک دوسرے کے حال سے بے گانہ ہی کر دیا تھا۔ اتنی بے حسی کیسے آ گئی تھی اُن سب میں؟ بلآخر! عمر نے ہمت کی اور پانی کی بوتل لیکر آگے بڑھا۔

"تم نے کل سے پریشان کر رکھا ہے۔ پاگل ہیں کیا ہم جو سارے کام کاج چھوڑ کر تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں؟ اور تم یہاں بچوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف ہو۔" اُس سے الگ ہوتا حسین اُسے ڈانٹ رہا تھا۔ وہ دونوں اب بھی زمین پر ہی بیٹھے تھے۔ رضا کا چہرہ جھکا ہوا تھا، آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔ حسین اُسکے کندھوں پر ہاتھ رکھے اُسے اب بھی ڈانٹ رہا تھا۔ عمر اب پنجوں کے بل بیٹھا اُسکی پیٹھ سہلا رہا تھا۔ مقدم نے بھی ہمت کر لی تھی۔ وہ عمر کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لیکر کھول رہا تھا۔ تاکہ رضا کو دے سکے۔ واپسی کی منزل کے مسافر، واپس آ چکے تھے۔

جب یاد کا قصّہ کھلوں تو، کچھ دوست بہت یاد آتے ہیں۔۔۔

پر دو لوگ اب بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکے تھے۔ ایک کی شرمندگی اسے اب سر بھی اٹھانے نہ دے رہی تھی۔ وہ علی سفیر تھا۔

اور دوسرا؟ دوسرا خود نہیں جانتا تھا کہ اسکے قدم منجمد کیوں ہو رہے ہیں؟ وہ چاہ کر بھی قدم آگے کیوں نہیں بڑھا پا رہا؟

ایس ایس پی نوید عالم کو واپسی کی منزل طے کرنے کے لیے وہ قدم ہی نہ مل سکے تھے۔ جو ایک واپسی کی چاہ رکھنے والے کے پاس ہونے چاہئیں۔

یا شاید۔۔۔۔

اُسے بھی ایک حسین جیسے دوست کی ضرورت تھی، جو اسے کھینچ کر منزل پر لے جاتا۔

----------+---------+--------

(جاری ہے)

نحل کی قسط نمبر سولہ آپ اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ کو میری ویبسائٹ اور فیس بک پیج پڑھ سکے گی۔ ان شاءاللہ